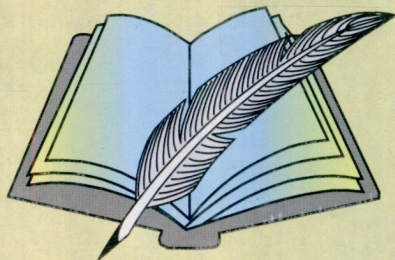


# شیخ محمد الغزالی

خودنوشت سوانح حیات، نظریات، تالیفات

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



ترجمہ و ترتیب

محمد ظہیر الدین بھٹی





## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

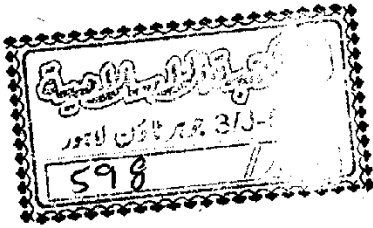
اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

**PDF** کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)





www.KitaboSunnat.com



# شیخ محمد الغزالی

خودنوشت سوانح حیات، نظریات، تالیفات

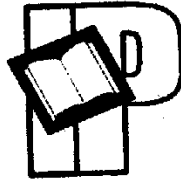
ترجمہ و ترتیب  
محمد طہمیر الدین کھٹی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

علم کے موتی

رہنما کتابیں

(جملہ حقوق حق ناشر محفوظ ہیں)



نام کتاب: شیخ محمد الغزالی

ترجمہ و ترتیب: محمد ظہیر الدین بھٹی

اشاعت: ایڈیشن

تعداد

۱۱۰۰

۲۰۰۰ء جولائی

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (بیجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک جہلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳- ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

فون: 7664504-7669546 فکس: 7658674

ای میل: islamic@ms.net.pk

شوروم: 10- چترجی روڈ، لاہور-7248676

www.Islamicpak.com

مطبع: میٹروپرنٹرز، لاہور

قیمت: 100/- روپے

# ترتیب

- 9..... پیش گفتار از مترجم
- 13..... تعارف
- 13..... شیخ محمد الغزالی کا اجمالی تعارف
- 15..... شیخ محمد الغزالی اور ان کی زندگی کے چند اوراق... طہ جابر العلوانی
- 16..... الملحد العالمی للفتح الاسلامی سے تعلق
- 21..... مسجد عمرو بن العاص کی آباد کاری
- 22..... ترک وطن کا فیصلہ
- 22..... شیخ غزالی اور مصری فوج
- 24..... شیخ محمد الغزالی کے افکار پر ایک نظر.... ڈاکٹر یوسف القرضاوی
- 25..... غزالی ایک داعی و مبلغ
- 25..... غزالی کے مروجہ فکر
- 25..... غزالی کے نزدیک داعی کی خصوصیات
- 25..... بصیرت و عقل
- 26..... شاعرانہ روح
- 26..... روحانیت
- 26..... غزالی اور قرآن حکیم
- 27..... شیخ کے قرآنی درس
- 27..... قرآن کریم پر توجہ کی ضرورت
- 28..... غزالی اور سنت نبوی ﷺ

- 29.....غزالی اور فقہ۔ غزالی کے تہذیب کے اصول
- 29.....کتاب وسنت بیک وقت۔ نص معصوم
- 30.....مصلح مرسلہ کی رعایت
- 30.....جملہ مکاحیب فکر کا احترام
- 30.....فقہ و عوت کے لیے
- 31.....غزالی۔ ایک مصلح و مجدد
- 31.....تجدید ایمان و ترکیہ نفس
- 32.....سیاسی استبداد کا مقابلہ اور حریت
- 32.....عدل اجتماعی
- 32.....عورت اور خاندان کی آزادی
- 34.....غلط فہمیوں کا ازالہ
- 35.....اسلام کا متوازن جامع نظریہ
- 36.....امت کی آزادی اور اتحاد
- 36.....امت سے کئے ہوئے گروہوں کا انضمام
- 37.....پسماندگی سے نکلنے اور ترقی کی طرف بڑھنے کی دعوت
- 38.....اسباب زوال امت
- 40.....ثقافت اور اسلامی ورثہ کی تطہیر
- 41.....اسلامی بیداری کے لئے راہ نمائی
- 43.....عرفی زبان کا احیاء
- 45.....شیخ محمد الغزالی کی خود نوشت سوانح حیات
- 45.....عجم کی یادیں
- 47.....کتب کی زندگی



- 48.....حفظ قرآن کیوں؟
- 49.....نظام مکتب کی اصلاح و تجدید
- 50.....ابتدائی تعلیم
- 52.....دینی و دنیوی تعلیم
- 54.....سیاسی اضطراب۔ مظاہرے کی قیادت، گرفتاری اور رہائی
- 55.....نتائج
- 57.....مرحلہ ثانویہ
- 58.....کچھ سوالات
- 59.....امام حسن البنا سے ملاقات
- 59.....اصول دین کالج میں داخلہ
- 60.....ایک عجیب واقعہ
- 61.....یورپ میں اسلام کی تعلیم
- 62.....قدیم ازہری تعلیم
- 63.....اساتذہ سے ہمارا رابطہ
- 65.....اخوان المسلمون کا ظہور
- 66.....مرشد کا گرامی نامہ
- 68.....ماحول کا منفرد مزاج
- 69.....نامنظور مطالبہ
- 70.....اخوان المسلمون کا مثبت کردار
- 71.....میری کچھ عادتیں
- 73.....عذر مقبول یا مجبوری
- 74.....قبولیت دعا، کرشمہ قدرت

- 76.....نصابِ تعلیم کے متعلق چند گزارشات۔
- 78.....ملازمت کی تلاش۔
- 78.....ملازمت کے لئے انٹرویو اور میری نا سمجھی۔
- 80.....ایک اہم انکشاف۔
- 81.....مسجد کے افتتاح کے لئے شاہ فاروق کی آمد اور ایک دلچسپ واقعہ۔
- 83.....شادی خانہ گبادی۔
- 84.....رفیقہ حیات کی جدائی۔
- 84.....اس وقت کے مسلمانوں کی حالتِ زار۔
- 86.....ایک ناکام کوشش۔
- 88.....جمہوریت۔
- 90.....عالمی نظام۔
- 91.....ایک صابر و شاکر محنت کش کالبدی آرام۔
- 93.....اخوانی واعظ۔
- 94.....جمہوری آزادیوں سے استفادہ۔
- 95.....سیاسی حالات اور جماعتِ اخوان۔
- 97.....آئین و دستور کے بارے میں ایک صاحب سے مکالمہ۔
- 99.....حکومت کا ایک عجیب فیصلہ۔
- 100.....اوقاف کا نظام تیس تیس۔
- 101.....نت نئی نئی خبریں۔
- 102.....فوجی ٹولے کا ظلم و جبر۔
- 104.....جب انور السادات نے جمعہ پڑھایا۔
- 106.....اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار۔
- 108.....میرے عزائم اور ماحول۔

- 109..... سرکاری ملازم کا احساس ذمہ داری
- 110..... اخوان المسلمون پر ظلم و تشدد اور دنیا دار علماء کا طرزِ عمل
- 113..... کتابوں پر پابندی
- 115..... میرا طریقِ دعوت
- 117..... میدانِ عربہ میں
- 118..... مختلف قسم کے داعی
- 119..... اشتراکی اتحاد میں شمولیت
- 134..... مسجد کی حفاظت اور تعمیر نو
- 136..... ایک نئی مصیبت..... اور اللہ کی بے پایاں رحمت
- 139..... فرعونی روش
- 140..... گرفتاری
- 148..... ڈکیتِ شپ کی خرابیاں
- 149..... ذلتِ ناک شکست
- 154..... انور السادات کے ساتھ
- 156..... دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت
- 157..... میزور کریت کاروبار اور میری حق گوئی
- 158..... عظمتِ کردار
- 159..... مسجد عمرو بن العاص کی کباہ کاری
- 161..... سیکریٹری وزارتِ قانون کے منصب پر تعین اور دونوں کے بعد استعفیٰ
- 162..... صدر سادات کی ملت فروشی
- 165..... شیخ غزالی کی تصانیف کا مختصر تعارف
- 187..... شیخ غزالی کے بارے میں کتابیں

## عرض ناشر

شیخ محمد الغزالی مصر کی ایک ممتاز علمی و دینی اور تحریری شخصیت ہیں جنہوں نے ساری عمر اسلام کی نشر و اشاعت اور مصر میں الحاد و بے دینی کے طوفان کا پوری جرأت و دلیری اور عالمانہ فراست کے ساتھ مقابلہ کیا انہوں نے شاہ فاروق کا دور بھی دیکھا اور پھر جمال عبدالناصر اور سادات کے اقتدار میں جبر و تشدد کا پورے صبر و استقلال اور جرأت و ہمت کے ساتھ سامنا کیا۔ زیرِ نظر کتب یوں تو شیخ محمد الغزالی کی خود نوشت ہے لیکن درحقیقت مصر کے ایک طویل تاریک دور کی تاریخ ہے جس کا ایک ایک لمحہ جبر و استبداد، فرعونیت آمریت اور اسلام دشمنی کا آئینہ دار ہے۔ یہودیوں اور سامراجیوں کے زیر اثر صدر ناصر نے جس طرح اسلامی تحریک کی علمبردار اخوان المسلمون کو کچلنے اور اس کی تنظیم کو تباہ کرنے کے لئے ظلم و تشدد کے ناقابلِ تصور حربے استعمال کئے اور اسلام کا نام لینے والوں کو قید و بند، پھانسیوں اور گڑوں اور جیلوں میں انتہائی وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنایا اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک اس خود نوشت سوانح عمری میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصر میں اسلام کے علمبرداروں اور اسلامی تحریک کے سرفروش کارکنوں نے کس طرح کے انسانیت کش حالات اور فضا میں سردھڑکی بازی لگا کر اسلام دشمنوں کے سارے حریفوں کو ناکام بنایا اور اسلام کے پرچم کو اپنے جسم و جان کی قیمت پر سر بلند رکھا۔

یہی ساری تفصیلات اس کتاب کی اصل اور بنیاد ہیں اور ان کا مطالعہ قاری کو اس طرح جذب کر لیتا ہے کہ کتاب کو ختم کیے بغیر اس کو چھوڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسلامک پبلی کیشنز نے کتاب کو خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں پیش کیا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

پروفیسر محمد امین جلاوید

(بیجنگ ڈائریکٹر)

## پیش گفتار از مترجم

The International Institute of Islamic Thought (العالمی للمفکر الاسلامی)

Islamic Thought کے زیر انتظام ایک عربی رسالہ ”اسلامیۃ المعرفة“ امریکہ اور ملیشیا سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے اپنے دوسرے سال کا ساتواں پرچہ (رمضان المبارک 1417ھ جنوری 1997ء کا شمارہ) ”شیخ محمد الغزالی نمبر“ کے طور پر نکالا۔ اس خصوصی نمبر میں عالم اسلام کے ممتاز اسکالر، محقق، مصنف اور عالم دین شیخ محمد الغزالی کی شخصیت و افکار پر مختلف خواتین و حضرات کے مضامین شامل ہیں۔ اسی شمارے میں شیخ کی یادداشتوں سے ایک انتخاب بھی چھپا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ ”مقطعات من مذکرات الشیخ“۔ ان یادداشتوں کے انتخاب کو اگرچہ شیخ کی خودنوشت مکمل سوانح حیات تو نہیں کہا جاسکتا البتہ شیخ نے اپنی زندگی کے تمام اہم ادوار کے بارے میں مختصراً اپنے قلم سحر نگار سے ہمیں متعارف کروایا ہے۔ یہ گویا ان کی زندگی کی مختلف جھلکیاں ہیں جو نہایت دل کش اسلوب میں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ خود نوشت سوانح حیات، اس سے پہلے کتابی صورت میں عربی زبان میں بھی نہیں چھپی۔ سب سے پہلے ”اسلامیۃ المعرفة“ کے رسالے نے اسے شائع کیا ہے۔

شیخ غزالی کا طریق کاری یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی زندگی کا کوئی واقعہ قلمبند کرتے ہیں، پھر اس پر تبصرہ کر کے اپنی بے لاگ رائے ظاہر کرتے ہیں گویا اس سوانح عمری کے دو فائدے ہیں اول یہ کہ قارئین شیخ غزالی کی زندگی اور اس دور کے حالات و واقعات سے آگاہ ہو جاتے ہیں دوم یہ کہ وہ شیخ غزالی کے عالمانہ نقطہ نظر اور محققانہ رائے سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور آہیں بھی۔ خندہ زیر لبی بھی ہے اور سسکیاں بھی۔ اس میں حق کی لاکڑ بھی ہے اور باطل کی کج رفتار کا تذکرہ بھی۔ مصر کے شاہ فاروق کا شیخ غزالی کی اقتداء میں نماز جمعہ پڑھنے کا دلچسپ واقعہ بھی اور کرئل انور السادات کے پیچھے غزالی جیسے عالم

دین کا نماز جمعہ پڑھنے کا عبرت انگیز سانحہ بھی۔ محمد الغزالی کا اشتراکی اتحاد میں شامل ہونے کا تلخ تجربہ بھی اور اخوان المسلمون کے ساتھ قید خانے میں محبوس رہنا بھی۔ تعلیمی مراحل کا دلکش بیان بھی ہے اور کیونستوں کا بے باکی سے مقابلہ بھی۔ غرض کہ یہ داستان حیات ایمان افروز بھی ہے اور جرات انگیز بھی۔ لائق مطالعہ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

شیخ محمد الغزالی کی اس خود نوشت سوانح حیات کو اردو قالب میں ڈھالنے کا مقصد، زیادہ سے زیادہ قارئین کو اس کتاب کے مندرجات سے باخبر ہونے کا موقعہ فراہم کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محترم طہ جلد العلوانی کے مضمون۔ ”شیخ محمد الغزالی و صفحات من حیاتہ“ اور..... ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے مضمون۔ ”نظرات فی تراث الشیخ الغزالی“ کا تلخیصاً ترجمہ بھی کر دیا ہے۔

شیخ غزالی ایک داعی، واعظ، خطیب، عالم دین اور انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق مصنف بھی تھے۔ آپ نے عربی زبان میں 59 دقیق کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن میں سے چند ایک کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ میں نے شیخ کی ان سب کتابوں کا مختصر تعارف بھی کر دیا ہے اور شیخ کے بارے میں اب تک جو کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ”شیخ محمد الغزالی“ کا مکمل تعارف پیش کرے گی اور اس کی اشاعت کے بعد مرحوم بر صغیر اور اردو خوان حلقوں میں غیر معروف نہیں رہیں گے۔

شیخ محمد الغزالی ایک حق گو خطیب اور نڈر مصنف تھے۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ عقوان شباب ہی سے اخوان المسلمون کے قافلہ میں شریک ہو گئے۔ وہ اخوان کے مرشد عام حسن البنا کے ہیبت قریب تھے۔ مرشد نے ہی انہیں اخوان کے مجلہ کا ایڈیٹر متعین کیا تھا۔ وہ ایک دقت سرکاری ملازمت کی ذمہ داری بھی نبھاتے رہے اور اخوان کے ذریعے غلبہ اسلام کے لئے کام بھی کرتے رہے۔ آپ ذات الہی پر بے پناہ توکل رکھنے والے شخص تھے۔ شیخ



نے حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، ان کی کتابوں پر پابندی لگی۔ ذرائعِ بلاغ کے لئے ”ممنوع“ ٹھہرائے گئے۔ آپ کو جامع ازہر میں جمعہ کا خطبہ دینے سے روک دیا گیا۔ اپنی زیرِ نگرانی مسجد عمر بن العاص کی تعمیر نو کروائی اور اسے آباد کیا تھا مگر صدر انور السادات نے اذانِ حق کو بند کرنے کے لئے، اس مسجد میں شیخ کے جمعہ پڑھانے اور خطبہ دینے پر پابندی لگا دی۔ انہیں اپنے سرکاری عہدے سے تنزیلی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر کبھی آپ نے اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا۔ کلمہ حق کہنے سے باز نہ آئے۔ انہیں محکمہ اوقاف کا سیکرٹری بنایا گیا مگر شیخ نے دو دنوں کے بعد اس پر کشش عہدے کو پائے استحقاق سے ٹھکراتے ہوئے استعفیٰ دے دیا اس لیے کہ وہ صدر انور السادات کی اغراض کا آلہ کار بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

شیخ محمد الغزالی اپنی رائے کے اظہار میں کسی نفع و ضرر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ نے مصر کے فوجی ڈکٹیٹر صدر جمال عبدالناصر کے سامنے اس جرات دہے باکی کا مظاہرہ کیا کہ شیخ کے قتلِ دوستوں کو ان کی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا مگر شیخ نے کبھی سود و زیاں کی پروا نہیں کی۔

شیخ محمد الغزالی جس بات کو حق سمجھتے اس کا برا مٹا اظہار کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اخوان المسلمون کی تحریک میں شامل ہونے کے بعد، مرشد عام حسن البنا کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود وہ اخوان کے اجتماعات میں اخوان کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بناتے اور جب تک انہیں دلائل و براہین سے مطمئن نہ کر دیا جاتا وہ اپنے موقف سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ مگر کسی کو ان کے خلوص پر شک نہ تھا۔ وہ جمہوری اسلامی قدروں پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے۔

سترہ سال تک اخوان المسلمون میں شامل رہنے کے بعد، انہیں، ان کے تنقیدی مزاج کی وجہ سے، جماعت سے گونگیسی لحاظ سے الگ کر دیا گیا مگر اس کے باوجود شیخ الغزالی ہمیشہ اپنے آپ کو اخوان ہی کا ایک فرد سمجھتے رہے اور آخر دم تک ان کے حامی رہے۔ ایک

موقعہ پر حکومت نے انہیں اخوان کے خلاف استعمال کرنا چاہا مگر شیخ غزالی نے پوری جرات و بے خوفی سے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں اسی روز نصف شب کے بعد گھر سے گرفتار کیا گیا، جھکڑی لگا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ (اس کی تفصیل شیخ غزالی کی خود نوشت سوانح حیات میں ملاحظہ فرمائیے!)

شیخ محمد الغزالی معاشرے کے کم زور و ناتواں اور زبردست طبقوں کے زبردست مؤید تھے۔ وہ عورتوں کے حقوق کے حامی تھے اور ان پر روار کھے جانے والے مظالم کے مقابلے کے لیے سینہ سپر رہتے۔ شیخ اکرمیت کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ ڈکٹیٹر شپ کی خرابیوں کو اپنی کتابوں اور مضامین میں نمایاں کرتے رہے، خاص اسی موضوع پر ایک کتاب ”الاسلام والاستبداد السیاسی“ لکھی۔ اس کتاب میں جاگیر داری، ڈکٹیٹر شپ اور فرد واحد کی حکمرانی پر تنقید کرنے کے بعد ثابت کیا کہ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔

شیخ محمد الغزالی نے ایک کامیاب بھرپور زندگی گزاری اور اپنی ساری عمر فروغ علم، غلبہ اسلام اور دعوت دین کا کام تندہی اور خلوص سے کیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ شیخ محمد الغزالی کے فہم اسلام کے بلند پایہ کام کو کسی خاص زبان و مکان تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ان کی اہم تر تصانیف کا ترجمہ و تلخیص کر کے اسے عام کیا جائے۔ کویت سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ”الجمع“ (17 تا 23 اگست 1999ء) کے مطابق شیخ محمد الغزالی پر سب سے پہلے ڈاکٹریٹ کرنے کا شرف کویتی محقق عمر عبد اللہ عبد الرحیم کو حاصل ہوا ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری اس ناتواں سعی کو اپنی بارگاہ بے کس پناہ میں قبول فرمائے اور اپنے اس ناچیز بندے سے، اسلام اور امت اسلامیہ کی خدمت کا کام لے۔

آمین۔ محمد ظہیر الدین بھٹی پشاور (یکم اکتوبر 1999ء)

## شیخ محمد الغزالی کا اجمالی تعارف

- ☆ شیخ الغزالی القاف 30 محرم 1341ھ (مطابق 22 ستمبر 1917ء) کو ”نکلا العتب“ مرکز ایٹائی البارود ضلع البحیرہ، مصر میں پیدا ہوئے۔
- ☆ آپ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اسکندریہ کے دینی ادارہ میں حاصل کی۔
- ☆ 1356ھ (1937ء) میں کلیۃ اصول الدین میں داخل ہوئے۔ اس وقت شیخ عبد المجید اللہان اس کالج کے پرنسپل تھے۔ اس ادارے میں ان کے اساتذہ میں
- ☆ شیخ عبد العظیم الزرقانی، شیخ محمود شلتوت، شیخ محمد یوسف موسیٰ نور شیخ محمد غلاب شامل تھے۔
- ☆ آپ 1362ھ (1943ء) میں مسجد العتبۃ الخضرۃ قاہرہ میں امام و خطیب مقرر ہوئے۔ شیخ محمد غزالی، جماعت اخوان المسلمون کے نمایاں اولین ارکان میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو شیخ حسن البنا کا تقرب حاصل تھا۔
- ☆ آپ نے پچاس کے عشرہ کے اوائل میں کسی جماعت میں شامل ہوئے بغیر، تحریک اسلامی کے میدانوں میں کام کیا۔
- ☆ آپ نے وزارت اوقاف کے مختلف عہدوں پر ترقی کی۔ آپ مستعار فی المساجد، پھر ازھر شریف میں داعظ، پھر شعبہ مساجد کے وکیل، پھر ڈائریکٹر مساجد اور
- ☆ ڈائریکٹر ٹریننگ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1391ھ (1971ء) میں ڈائریکٹر جنرل برائے دعوت و ارشاد کے منصب پر آپ کا تعین ہوا۔ اسی سال
- ☆ آپ کا تقرر مصر کی وزارت اوقاف میں سیکرٹری برائے امور دعوت اسلامی کے طور پر عمل میں آیا۔
- ☆ 1397ھ (1977ء) میں آپ کی خدمات، مکہ مکرمہ کی ام القری

یونیورسٹی میں بہ طور پروفیسر مستعار لی گئیں۔

☆ 1401ھ (1981ء) میں وزارتِ اوقاف کے سیکرٹری برائے امورِ دعوتِ اسلامی مقرر ہوئے۔ قطر یونیورسٹی میں کام کیا۔

☆ آپ کو جامعۃ الامیر عبدالقادر برائے علومِ اسلامی قسطنطنیہ (الجزائر) میں صدرِ مجلسِ علمی بنایا گیا۔ جس سے آپ نے 1409ھ (1989ء) میں استعفاء دے دیا۔

☆ شیخ محمد غزالی نے اکثر عرب ممالک کا دورہ کیا۔ کئی افریقی، ایشیائی، یورپی اور امریکی ممالک کا دورہ کیا۔ لور وہاں دعوتِ اسلامی کی سرگرمیوں میں شمولیت اختیار کی۔

☆ آپ زندگی کے آخری سالوں میں، قاہرہ کے ”المعهد العالمی للفکر الاسلامی“ کے صدر رہے۔

☆ آپ تقریباً ساٹھ کتابوں کے مؤلف ہیں۔ آپ کی سب سے پہلی کتاب تھی۔ ”الاسلام والاوضاع الاقتصادية“۔ آپ کی شائع ہونے والی آخری کتاب ہے۔

☆ ”التفسیر الموضوعی للقرآن الکریم“۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔

☆ شیخ محمد الغزالی، 19 شوال 1416ھ (مطابق 9 مارچ 1996ء) کو جب ریاض میں ایک نظریاتی و فکری کنونشن میں شرکت کر رہے تھے، اپنے ربِ کریم سے جا ملے اور مدینہ منورہ کے قبرستانِ جنّۃ البقیع میں سپردِ خاک کیے گئے۔

# شیخ محمد الغزالی اور ان کی زندگی کے چند اوراق

تحریر: طہ جابر العلوانی

ترجمہ و تلخیص: محمد ظہیر الدین بھٹی

شیخ محمد الغزالی کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں ایسی بہت سے اعلیٰ خصال و صفات کا تصور آتا ہے جو بہت کم ہی ہمارے کسی معاصر عالم دین میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی ان خصال حمیدہ میں سے کچھ یہ ہیں۔

(۱)۔ مجتہد اندہیمت کی وسعت جو مقاصد شریعت، اسلام کے تمام مصادر اور اس کی غایات پر مبنی تھی۔

(۲)۔ دقیق فہم پر مبنی توازن و اعتدال۔ اسلام کی اعلیٰ اقدار (توحید، عمران اور تزکیہ) کا گہرا ادراک اور مسلسل تقہم۔

(۳)۔ اسع اسلامیہ سے گہری وابستگی اور پچی غیرت۔ اپنی ملت کی تاریخ، اس کے ماضی حال، مستقبل اور اتحاد سے پچی لگن۔

(۴)۔ تنقیدی صلاحیت، عقلی قوت، وسیع و متنوع علم، ذہانت و طباعی، امت کی خدمت اور اس کے گونا گوں مسائل سے عمدہ آہونے کے لئے ہر کار آمد و مفید جدید علم کا زیادہ سے زیادہ حصول۔

(۵)۔ اپنے رب، نبی، امت، اپنے دوستوں اور شاگردوں سے محبت و وفا۔ وسیع قلب۔ آپ کا دل ہر قسم کے دھوکہ، کینہ، بغض و حسد اور کدورت و نفرت سے پاک تھا۔

## المعهد العالمی للفکر الاسلامی سے تعلق

شیخ محمد غزالی کا (The International Institute of Islamic Thought) سے تعلق اس وقت سے تھا جب اس کا ابھی باقاعدہ طور پر، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قیام بھی عمل میں نہیں لایا گیا تھا۔ اس ادارے کے بانیوں اور کارکنوں سے ان کے گہرے اور مضبوط دوستانہ تعلقات تھے۔

شیخ غزالی اور شہید ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کے دوستانہ روابط اس وقت شروع ہوئے جب ڈاکٹر فاروقی نے شیخ کی کتاب ”من هنا لعلم“ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب شیخ خالد محمد خالد کی کتاب ”من هنا نبدا“ کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ شہید فاروقی کہا کرتے تھے۔

”میں نے دونوں کتابیں پڑھیں۔ مگر میں اسلوب و مضمون دونوں لحاظ سے شیخ محمد الغزالی کی کتاب سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ امریکی لوگ کیونز م اور سوشلزم کے بارے میں مسلمانوں کے حقیقی موقف سے باخبر ہو سکیں۔ میں نے جب اس سلسلہ میں شیخ غزالی سے رابطہ کیا تو انہوں نے خوشی مجھے اس کا ترجمہ کرنے کی اجازت دے دی“

ڈاکٹر فاروقی 1986ء میں ایک قاتلانہ حملہ کے نتیجے میں شہید ہوئے تو شیخ محمد غزالی نے ان کی وفات کو امت کے لئے ایک عظیم المیہ قرار دیا۔ وہ جن رسائل و اخبارات میں لکھا کرتے تھے ان میں ڈاکٹر شہید کے بارے میں اپنے تاثراتی مضامین لکھے۔ شہید کو اپنا دوست اور عزیز کہا اور لکھا کہ یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ان کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

برادر م ڈاکٹر عبدالحمید ابوسلیمان کے ساتھ بھی شیخ غزالی کے گہرے مراسم تھے جو



شیخ کی وفات تک قائم رہے۔

راقم السطور کا شیخ سے تعلق تو بہت پرانا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ازہر میں زیر تعلیم تھا۔ ان تعلقات میں آئے دن بڑا اضافہ ہی ہوتا رہا۔

عالم عرب اور بالخصوص مصر سے دلچسپی رکھنے والوں نے شدت سے محسوس کیا کہ عالم عرب میں فکری اضطراب ہے اور وہاں کسی ایسی شخصیت کی سخت کمی ہے جو درست و موزوں راہنمائی کر سکے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے جن محدودے چند افراد کے نام ذہن میں آتے تھے۔ ان میں سر فرست شیخ غزالی تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ شیخ مصر واپس جائیں اور وہاں کسی ایسے منصب پر فائز ہوں کہ یہ خلا آسانی سے پر کیا جاسکے۔

شیخ موصوف کے کچھ عقیدت مند اور شاگرد یہ سمجھتے تھے کہ شیخ الجزائر سے مصر صرف دو صورتوں میں جائیں یا تو شیخ الازہر بن کر۔ یا اخوان المسلمون کے مرشد عام کی حیثیت سے۔ اس پر ان کے اپنے دلائل تھے۔ شیخ غزالی کا تنقیدی مزاج، ماضی میں حکمرانوں کے رویوں پر صدائے احتجاج بلند کرنا اور کئی دیگر وجوہ سے شیخ الازہر کے منصب پر آپ کا تقرر عمل میں نہ آسکا۔

باوجودیکہ غزالی اخوان المسلمون کی اساسی کمیٹی کے ایک رکن رہے تھے، استاد حسن البنا کے مخلص شاگرد اور ان کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھے مگر آپ کو مرشد عام بنانے کی تجویز اس لئے قبول نہ ہو سکی کہ استاد محمد حامد ابو النصر ان سے عمر میں بڑے تھے نیز شیخ دوسرے ارکان کے مقابلہ میں قید و بند میں بھی کم مدت کے لئے رہے تھے۔ سترہ سال تک جماعت میں رہنے کے بعد، اخوان کے مرشد عام حسن الہضیبی کے ساتھ ان کا اختلاف اور 1956ء میں جماعت سے ان کا نکالا جانا بھی اس منصب پر آپ کے فائز نہ کئے جانے کا ایک سبب بنا۔

متذکرہ صدر کوششوں کی ناکامی کے بعد شیخ کے لئے مصر سے باہر کسی یونیورسٹی

میں پروفیسر بن کر رہنا آسان تھا کہ یوں وہ اپنے طلبہ اور عقیدت مندوں میں اپنے افکار، تجربات اور مہارت و تجربہ کو پھیلاتے رہتے۔ مگر ہمارے ادارے کو شیخ کی خدمات کی بہت ضرورت تھی کہ وہ مصر میں قیام کریں۔ سبھی حضرات شیخ کی صلاحیتوں سے حثی واقف تھے۔ شیخ کی شخصیت کا مصر جیسی مرکزی اور اہم جگہ پر ہونا ایک نیک فال تھا یعنی غیر معمولی فہم ایک غیر معمولی جگہ پر ہوتا۔ شیخ کو اکادمہ کرنے کی یہ مہم مجھے شہسوپی گئی۔ چنانچہ میں نے آپ کو اس پر اکادمہ کر لیا۔

شیخ کی مصر واپسی کا وقت آگیا۔ اب وہ ادارہ کے قاہرہ دفتر کی مجلس علمی کے چیئرمین، اس کے نمایاں ترین مشیر اور اس کے پالیسی ساز تھے۔ اس مجلس علمی میں، نہ صرف مصر کی حد تک بلکہ عالمی سطح کے منتخب مفکرین شامل تھے۔ ان بلند پایہ مفکرین کے ساتھ کچھ ماہر اساتذہ بھی تھے جنہیں مجلس ان کی ماہر لہ آراء سننے کے لئے اس وقت بلا لیتی تھی جب ایسے امور زیر بحث آئیں جن کے لئے زیادہ مہارتوں اور اضافی تخصصات کی ضرورت ہو۔

اس مجلس کا ماہنامہ... یا حسب ضرورت... اجلاس شیخ غزالی کے دفتر میں ہوتا جو ان کے گھر کے نیچے واقع تھا۔ یہ موقعہ ہوتا تھا حثوں، لیکچروں اور تحقیقات کی بہترین پیداوار کا۔ شیخ مرحوم ان تمام سرگرمیوں میں مرکزی کردار ہوتے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ لیکچر، ملاقات یا کانفرنس میں شامل نہ ہوں۔ اسی مرحلے میں شیخ نے اپنے گراں قدر مطالعہ جات تیار کئے۔ چنانچہ اسی دور میں آپ کی یہ چار کتابیں شائع ہوئیں۔ کیف تعامل مع القرآن، السیۃ النبویۃ بین اہل اللہ و اہل الحدیث، التفسیر الموضوعی اور تراث الفکری فی میزان الشرع والعقل۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے تقریباً ایک ہزار لیکچر ز اور چھوٹے بڑے مضامین تیار کئے۔ اس مرحلے کی خاص بات یہ ہے کہ تحریری صورت میں ڈھلنے سے پہلے شیخ غزالی کی زیادہ تر فکر، انسٹیٹیوٹ کے زیر انتظام ملاقاتوں، مجلسوں اور اجتماعی مباحثوں سے گزری۔ فقہ السیرۃ کے سوا یہ امتیاز شیخ کی کسی اور کتاب کو نہ مل سکا۔

شیخ غزالی اپنی عمر کے اس مبارک مرحلے میں اپنی زندگی کے اہم تجربات اور مہارتوں کو ریکارڈ کروانے میں کامیاب ہوئے۔ ہمارے انٹینیوٹ نے عصر حاضر کی کچھ اہم شخصیتوں کی مہارتوں اور ان کے تجربات کے خلاصہ کو سمعی و بصری سطح پر ریکارڈ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ طے یہ پایا کہ پہلے ان اہم شخصیتوں کی علمی پیداوار (کتب و رسائل وغیرہ) کا ماہر اساتذہ تحقیقی مطالعہ کریں پھر متعلقہ شخصیت سے علمی گفتگو کریں۔ اس گفتگو اور بحث کو ریکارڈ کر لیا جائے۔ اس عمل کا آغاز شیخ الغزالی اور ڈاکٹر نجیب محمود سے ہوا۔ شیخ کی تمام کتابیں یکجا کر کے پہلے ممتاز مفکرین کو پیش کی گئیں تاکہ وہ پہلے ان کا اچھی طرح مطالعہ کریں۔ اس کے بعد شیخ موصوف سے ان کے افکار پر گفتگو کریں۔ ان کی عملی و فکری زندگی کا کھوج لگائیں اور آپ کی شخصیت کی تعمیر میں کار فرما مختلف عناصر اور پہلوؤں کو نمایاں کریں۔

یہ سمعی و بصری ریکارڈنگ پندرہ گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ اس کی خاص بات شیخ کی کتابوں، لیکچروں اور مقالوں میں مدون فکر کے پس پردہ... یا... ماوراء الفکر کی دریافت ہے۔ اس طرح بہت سے ان مواقف اور واقعات کی مدد اور است و ضاحت کی گئی ہے جن کا شیخ کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور قارئین ان کے بارے میں وضاحت سے نہیں جانتے۔

اس ریکارڈنگ میں ایک طرح کی ذاتی تنقید نیز بہت سے مسائل و افکار سے رجوع بھی پایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہماری علمی دنیا میں اس کا چلن نہیں ہے۔ یہاں پر انسان اپنے غلط یا صحیح موقف پر ڈٹا رہتا ہے اور اس سے رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر شیخ محمد الغزالی پر جب اصل حقیقت منکشف ہوتی تو وہ حق و صواب یا راج رائے کی طرف پلٹنے اور اپنی پہلی رائے سے دستبردار ہونے میں لمحہ بھر کی تاخیر روا نہ رکھتے تھے۔

اس ریکارڈنگ میں انہوں نے بعض صحابہ..... وہ صحابہ جنہوں نے حضرت علیؑ کی مخالفت کی تھی..... پر تنقید سے اپنے رجوع کا ذکر کیا ہے۔ شیخ غزالی بیان کرتے ہیں۔

”ایک روز میرے دوست علامہ الباقوری نے مجھے اپنے گھر بلوایا۔ جو نمی میں جا کر

بٹھانہوں نے کہا۔ ”یا شیخ! آپ کے اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے مابین کیا معاملہ ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے اور ان کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں سوائے اس کے کہ میں جامع عمرو میں جمعہ پڑھاتا ہوں۔“ شیخ الباقوری نے کہا۔ ”آپ یہ بات رہنے دیجئے اور مجھ سے یہ خواب سنئے۔ اس کے بعد آپ اس خواب کی تعبیر کر لیجئے۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں اس گھر میں ہوں کہ ایک منادی ندا کر رہا ہے۔ گورنر صاحب تشریف لارہے ہیں گورنر صاحب تشریف لارہے ہیں۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ کون گورنر؟ انہوں نے کہا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ۔ اتنے میں آپ تشریف لائے۔ میں نے آپ کی طرف دیکھا تو مرعوب ہو گیا۔ حضرت عمروؓ نے فرمایا۔ ”شیخ الغزالی سے کہہ دینا کہ وہ مجھ پر جو تنقید کرتے ہیں، میری شان گھٹاتے ہیں۔ میں نے انہیں سب معاف کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے میری مسجد آباد کی ہے۔“

شیخ الغزالی کہتے ہیں۔ یہ خواب سن کر میں زار و قطار رويا۔ میں سمجھ گیا کہ خواب میں اشارہ ہے اس بات کی طرف جو میرے دل میں تھی اور کبھی کبھی میں اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یعنی میری ان صحابہؓ سے نفرت، جنہوں نے حضرت علیؓ سے لڑائی کی یا ان کی مخالفت کی۔ مجھے بالخصوص حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ سے نفرت تھی۔

خوب رونے کے بعد میں نے علامہ الباقوری سے کہا۔ میں آپ کے سامنے اپنے موقف سے رجوع اور توبہ کا اعلان کرتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کی ہم نشینی کا شرف حاصل کرنے والے تمام صحابہ کے معاملے کو اللہ اور رسول ﷺ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی بہتر و موزوں ہے۔ ہمیں اپنی پسماندگی اور ناکامی کی ذمہ داری ان پر نہیں ڈالنی چاہیے۔ حضرت عمروؓ نہ ہوتے تو میں کیا ہوتا؟ اگر وہ مصر فتح نہ کرتے تو کیا اب میں مسلمان ہوتا؟

## مسجد عمر و بن العاص کی آباد کاری

(نوٹ: اس کی تفصیل شیخ غزالی کی خود نوشت سوانحری میں پڑیے۔ یہاں صرف ان چند باتوں کا اضافہ ہے جن کا وہاں ذکر نہیں اور جن کا علم محولہ بالا ریکارڈنگ سے ہوا ہے۔ محمد ظہیر الدین بھٹی)

فاتح مصر حضرت عمر و بن العاص کی مسجد، قاہرہ کے جنوب میں واقع فسطاط شہر میں ہے۔ یہ ایک عوامی علاقہ ہے جو ”پرانا مصر“ کہلاتا ہے۔ اس مسجد کے ارد گرد کسی منصوبہ بندی کے بغیر اندھا دھند عمارتیں ہیں۔ اینٹوں کے بھے اور چڑا صاف کرنے کے کارخانے ہیں۔ یہ مسجد بالکل ہی غیر آباد ہو چکی تھی اور مصر کے باقی ماندہ اسلامی آثار میں شمار ہونے لگی تھی۔ اگرچہ اس کی انتظامی ذمہ داری وزارتِ لو قاف سے متعلق رہی۔ محکمہ آثارِ قدیمہ اسے وزارتِ لو قاف کی ذمہ داری سمجھتا رہا کہ اس کی دیکھ بھال، تعمیر نو وغیرہ اسی کی ذمہ داری ہے۔ قریب تھا کہ مصر کی یہ پہلی جامع مسجد بے نام و نشان ہو کے رہ جاتی۔ خوش قسمتی سے ڈکٹر عبد الحلیم محمود (رحمہ اللہ) کو زیرِ او قاف سے اور انہوں نے اس مسجد میں جمعہ پڑھانے کے لئے شیخ محمد الغزالی سے کہا۔ شیخ نے اس کی صفائی ستھرائی کے لئے دوسروں کے علاوہ جامع ازہر میں اپنے پچاس شاگردوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ بعد میں جب قاہرہ یونیورسٹی میں شیخ کے طلبہ کو پتہ چلا تو انہوں نے اس سعادت سے محروم ہونے پر شیخ سے شکوہ کیا۔

شیخ کے ہول: میں اپنے خطبوں میں قرآن کریم کی موضوعی تفسیر بیان کرنے لگا۔ سورہ فاتحہ سے آغاز کیا اور ارادہ تھا کہ اسے سورۃ الناس تک پہنچاؤں گا۔ دو تین حصوں کے بعد تو مسجد اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود نمازیوں کے لئے تنگ ہو گئی۔ بہت سے نمازی جو قاہرہ شہر سے باہر کے رہنے والے تھے، کرائے کی گاڑیوں میں جامع عمر و پہنچتے۔ میں سورۃ النساء پر پہنچا تھا کہ اسی دوران پارلیمنٹ میں پرسل لاء زیرِ بحث تھا۔ انور سادات نے سمجھا

کہ میں سورۃ النساء کی کثرت کی تفسیر جان بوجھ کر اس طرح کر رہا ہوں کہ اس قانون کا احکام قرآن کا مخالف ہو نا اہم ہو جائے۔ چنانچہ انور سادات نے مجھے خطبہ دینے سے روک دیا جب نمازیوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق پندرہ ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔

## ترک وطن کا فیصلہ

اس موقع پر شیخ نے ترک وطن کا فیصلہ کیا اور مکہ مکرمہ چلے گئے۔ جہاں وہ ام القریٰ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ریڈیو سے تقریریں کرتے۔ سعودی رسائل و اخبارات میں مضامین لکھتے۔ ریڈیو پر ہونے والی کپ کی تقاریر کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر تقاریر اذکار القرآن الکریم میں ہوئیں۔

## شیخ غزالی اور مصری فوج

شیخ غزالی نے مصری قوم اور فوج کی زندگی کے مختلف مرحلوں کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ فوجی جوان اور افسر خوب بے جگری سے لڑے وہ ہر قربانی کے لئے تیار ہیں۔ پہلی تین جنگوں کی اعلیٰ قیادت کے بارے میں شیخ غزالی اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ وہ 1967ء کی جنگ کو ایک عظیم شکست سمجھتے تھے۔ اور اس کا ذمہ دار ”نشہ باز غافل قیادت“ کو قرار دیتے۔ وہ فوج اور عوام کو اس شکست سے بری الذمہ قرار دیتے تھے۔ شیخ غزالی فوج اور عوام کی حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ وہ شکست کا سبب ہائی کمان کے جبر و استبداد اور شورشِ رائیت و جمہوریت کے سادہ ترین قواعد و ضوابط کی نظر اندازی کو سمجھتے تھے۔ دس رمضان 1973ء کی جنگ میں کامیابی کا اولین سبب ان کے نزدیک فوج کا بلند اسلامی مورال ہے۔ مسلح افواج میں ازھر کے پچاس دینی رہنماؤں کی موجودگی..... جو بہر عالم، داعی اور بلند پایہ خطیب تھے... اس بلند مورال کا سبب بنی۔ ان علماء کے سرخیل شیخ



عبدالحلیم محمود اور شیخ غزالی تھے۔ ان دینی رہنماؤں نے مسلح افواج کے افرلو میں ایسی اعلیٰ نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دی کہ 1973ء کی جنگ میں انہوں نے اولوالعزیز، بھادری اور فداکاری کے عمدہ نمونے پیش کئے ایسے نمونے جو دور نبوت ﷺ سے لے کر اب تک تاریخ اسلام میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ شیخ غزالی اور ان کے رفقاء نے مصری جانباڑوں میں اسلامی نفسیاتی بنیاد رکھ دی۔ ان کی رگوں میں خون کو حرکت دی جس سے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف معرکہ آراء ہونے کے قابل ہو سکے۔

شیخ الغزالی نے الازھر، جامع عمرو بن العاص، قاہرہ اور دوسرے شہروں کی مساجد اور 1973ء سے پہلے مصری فوج میں جو تقاریر کیں، لیکچر دیئے، جامعہ ام القری، الجزائر اور دیگر یونیورسٹیوں میں جو لیکچر دیئے یہ سب بھترین تلخیص تھی حسن البنا شہید کے دروس کی۔ نیز گزشتہ صدی کے لوہو اور موجودہ صدی کے اوائل کی دیگر اصلاحی تحریکوں کے قائدین کے خطابات کی۔ اس پر شیخ نے اپنے علم و فضل کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سامعین آپ کے خطاب سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ شیخ غزالی پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ ان کا شمار اپنے صالح بندوں میں کرے۔ آپ کی وفات سے امت ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گئی۔ جب کہ ہمارے ادارے کو ایک سرگرم، سرپرست اور دیانتدار قائد سے محرومی کا ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

## شیخ محمد الغزالی کے افکار پر ایک نظر

تحریر: ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ترجمہ و تلخیص: محمد ظہیر الدین بھٹی

### غزالی ایک داعی و مبلغ

میں نے شیخ غزالی کو ایک مرد مبلغ پایا۔ یہ خصوصیت ان پر غالب تھی۔ ان کا تانا بانا، ان کے دنوں کا شغل، ان کی راتوں کا خواب بلکہ ان کی پوری زندگی کا محور اسلام تھا۔ اس کا ماضی، حال اور مستقبل۔ وہ ہر وقت اسلام کے بارے میں سوچتے۔ اسی کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اسی کی طرف بلا تے اور اسی سے مدد لیتے تھے۔ غزالی کی سامی جدوجہد اور تنگ و دو اسلام کی طرف بلانے میں تھی۔ انہوں نے اپنا دین اللہ کے لئے خالص کر لیا تھا تو اللہ نے بھی انہیں اپنے دین کے لئے جن لیا تھا۔

اپنی بھرپور ازہری تعلیم کے بعد، شیخ نے اپنے آپ کو دعوت و اصلاح کے کام کا اہل بنا لیا تھا۔ قرآن شریف تو انہوں نے چھن ہی میں یاد کر لیا تھا اور وہ اس وقت سے ہی ذوق و شوق سے اس کی تلاوت کر رہے تھے۔ شیخ غزالی کہتے ہیں۔

”میں ہر چیز پڑھا کرتا تھا۔ کوئی معین علم مجھ پر غالب و حاوی نہ تھا بلکہ میں تو چلتے پھرتے اور کھانا کھاتے ہوئے بھی پڑھتا رہتا تھا۔ مطالعہ کی داعی کو بہت ضرورت ہے۔ مطالعہ ہر فقہ و داعی کے لئے مضبوط سہارا ہے۔ دینی امور میں گفتگو کرنے والے کے لئے کم زور مطالعہ یا دھوری تعلیم ایک بڑا عیب ہے۔ مطالعہ ہی وہ واحد چیز ہے جو دنیا اور اس کے امور و معاملات کے بارے میں صحیح فکر جماتا ہے، مختلف مفاہیم کو درست حد بندیوں میں رکھتا ہے۔ فقہاء و مبلغین کی کوتاہ فہمی کا زیادہ تر سبب ان کی تعلیمی کمی ہوتی ہے۔ داعی کے لئے

ضروری ہے کہ وہ ہر چیز کو پڑھے۔ عقائد کی کتابیں پڑھے، الحاد کی کتابیں پڑھے، احادیث کی کتب کا مطالعہ کرے، فلسفہ پڑھے مختصر یہ کہ داعی ہر انسانی فکر کا مطالعہ کرے تاکہ وہ زندگی اور اس کے گونا گوں پہلوؤں سے متعارف ہو جائے۔“

## غزالی کے مراکزِ فکر

شیخ غزالی کی فکر کا اولین مرکز قرآن کریم اور دوسرا سنت نبوی ﷺ ہے۔ ان کا تیسرا مرکز فکر، عام انسانی تاریخ اور تاریخ اسلام ہے۔ تاریخ اسلام میں وہ سیرت نبوی ﷺ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا چوتھا مرکز فکر عام تعلیم، دینی تعلیم اور انسانی تعلیم تھا۔ آپ کا پانچواں فکری مرکز تھا۔ صورت حال اور اس کا ادراک۔ مقامی، صوبائی، اسلامی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہ کر ان کی سمجھ۔

## غزالی کے نزدیک داعی کی خصوصیات

### (۱)۔ بصیرت و عقل

شیخ محمد الغزالی کے نزدیک ذہانت، ہدایتی فکر اور روشن خیالی، صحیح ایمان کی تشکیل کے لئے ضروری عناصر ہیں۔ ایمان یقین کی حد تک پہنچی ہوئی معرفت کا نام ہے جس میں شک و شبہ قطعاً نہیں ہوتا۔ اگر واضح ادراک اور پختہ فہم نہ ہو تو یقین نامکمل رہتا ہے۔ صرف ذہین عقل ہی اسرارِ کائنات اور مختلف زمان و مکان میں موجود آیاتِ الہی کو سمجھ سکتی ہے۔ ذہین عقل ہی حق و باطل میں تمیز اور وحی کے حقائق کا ادراک کر سکتی ہے۔ یہی ماضی کی عبرتوں اور طویل انسانی تاریخ سے نفع اندوز ہو سکتی ہے۔ اصحابِ عقل ہی اشخاص اور مسائل کے بارے میں درست فیصلے کر سکتے ہیں۔ عقلوں کی تربیت کرنا، صلاحیتوں کو چلا دینا اور انسانی استعدادوں کو ابھارنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

## (۲)۔ شاعرانہ روح

داعی کے لئے شیخ غزالی شاعرانہ روح کو ضروری سمجھتے تھے۔ خود شیخ غزالی نے اگرچہ شعر نہیں کہے مگر وہ شاعرانہ جذبہ کے حامل تھے۔ آپ زمین کے ہر پودے اور آسمان کے ہر ستارے کو اللہ کی وحدانیت کا گواہ اور حمد الہی کا وسیع خواں سمجھتے تھے۔ بہت سے مقامات پر آپ کی نثر، شاعری کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ شیخ محمد غزالی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والا شخص یہ بات تسلیم کرے گا کہ آپ ایک منفرد اسلوب کے حامل عظیم ادیب ہیں۔ آپ کسی معین اولیٰ مکتب کی طرف منسوب نہیں۔ آپ فکر، علم اور ادب میں صرف محمد بن عبد اللہ ﷺ کے مکتب کی طرف انتساب کے خواہاں رہے ہیں۔ اگر شیخ کو صرف ادب کے لئے کام کرنے کا موقع ملتا تو وہ دنیائے عرب کے نامور عظیم ادیبوں میں شمار ہوتے۔

## (۳)۔ روحانیت

شیخ غزالی کے نزدیک ہر اس شخص کے لئے روحانیت ضروری ہے جو اسلام کا داعی ہو۔ اس سچی روحانیت کا منبع و مصدر معرفت الہی، اللہ پر سچا ایمان، اس کے حضور حاضری اور حساب و جزاء کا یقین اور قیامت کو اس طرح حاضر و موجود سمجھنا گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس روحانیت کے لئے کسی مخصوص ”مثنیٰ و چلے“ کی نہیں بلکہ خشیت، امید، صبر، شکر، محبت وغیرہ ان تمام اخلاق کی ضرورت ہے جن کے بغیر ایمان صفر ہوتا ہے۔

## (۴)۔ غزالی اور قرآن حکیم

شیخ غزالی کو قرآن حکیم سے خصوصی مناسبت تھی۔ دن رات تلاوت میں مصروف رہتے، آپ کو قراءت یا مراجعت کے لئے نسخہ کی ضرورت نہ پڑتی۔ آپ کا سینہ ہی

مصنف قبلہ قرآن شریف کے ساتھ اس دائمی ربط کی وجہ سے قرآن کے معانی و محارف ہمیشہ ان کو اذہر رہتے۔ آپ کی سب کتاہیں اس بات پر گواہ ہیں کہ آپ کیا قرآن سے بہترین استشہاد کرتے تھے اور ان سے نئے معانی نکالتے۔ آپ ظلم و جہالت اور فساد و استبداد کے خلاف معرکہ میں قرآن شریف سے ہی جت پکڑتے۔ آپ کی بیوہ کی ہونے والی جس اور زندگی کے حقائق پر آپ کی نظر سے اس میں آپ کو مدد ملتی۔

## (۵)۔ شیخ کے قرآنی درس

مرف قرآن کریم کے مطالعہ جات پر شیخ کی تین کتاہیں ہیں۔

(۱)۔ نظرات فی القرآن: اس کتاب میں علوم قرآن پر جدید اسلوب میں گفتگو

ہے۔

(۲)۔ الحاوری الحمرۃ للقرآن الکریم: یہ آپ کی آخری کتاہوں میں سے ہے۔ اس میں

ان بنیادی محوروں کا بیان ہے جن کے گرد قرآنی صورتیں اور آیتیں گردش کرتی ہیں۔ یہ ہیں۔ اللہ واحد، اپنے خالق پر دلالت کرنے والی کائنات، قرآنی قصص و جزاء، تربیت اور قانون سازی۔

(۳)۔ التفسیر الموضوعی للقرآن: یہ تیسری کتاب ہے۔ آپ نے اس کتاب میں

ہر سورت کا مرکزی نکتہ بتایا ہے جس کے ارد گرد وہ سورت گھومتی ہے۔ آپ نے سورت کی وحدت کے اظہار کے لئے اس کے لول و آخر کا باہم مربوط ہونا واضح کیا ہے۔ اس موضوع پر آپ کے نظریات لائق توجہ ہیں۔

## قرآن کریم پر توجہ کی ضرورت

شیخ کتاب اللہ پر توجہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ ”میں اس لئے زور

دیتا ہوں کہ کچھ لوگ مسلسل تسبیح احادیث کا مطالعہ کرتے رہے اور قرآن شریف کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کے افکار میں کچھ کجی پیدا ہو گئی۔ جہاں پھیلنا ہوتا ہے وہاں وہ سنستے ہیں، جہاں سٹنا ہوتا ہے وہاں وہ پھیلتے ہیں، جہاں ہوش کی ضرورت ہے وہاں انہیں جوش آتا ہے۔ جہاں اٹھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں گر جاتے ہیں۔“

قرآن کے معانی اور اس کے مقاصد پر غور و فکر سے اسلامی مشن واضح ہوتا ہے۔ ہدایات میں سے اہم اور اہم ترین کا پتہ چلتا ہے۔ نیز سنتوں کو ان کے درست مقام و محل پر رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم پر گہری نظر رکھنے والا انسان کائنات میں بھی دقیق نظر سے کام لیتا ہے۔ اسماء حسنیٰ اور اعلیٰ صفات کے بارے میں اس کا دماغ روشن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر وہ سن صحاح کا مطالعہ کرے جو قرآن کی تفسیر کرتی اور اس کی ہدایات کی وضاحت کرتی ہیں تو انسان کی رشد و ہدایت کامل ہو جاتی ہے۔

## غزالی اور سنت نبوی ﷺ

شیخ غزالی ہم قرآن کے لئے سنت کو ضروری قرار دیتے ہیں اس لئے کہ سنت قرآن کی نظری شرح اور عملی تطبیق ہے۔ اس موضوع پر آپ نے اپنی شاندار کتاب فقہ السیرۃ لکھی۔ آپ کے نزدیک اصل قانون اور اس کی عملی تطبیق دونوں کا احترام ضروری ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے، شیخ غزالی کی نمایاں کتاب، جس میں آپ نے سنت کا مقام اور قرآن سے اس کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ ”لیس من الاسلام“ ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ قرآن کا باقی مآخذ دین کے لیے وہی مقام ہے جو تھے کا درخت میں، اس کی شاخوں اور پھلوں، پھولوں کے لئے ہوتا ہے۔ سنت سمجھے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے۔ اور سنت کو سمجھنے کے لئے ان حکیمانہ مناسبتوں سے واقفیت ضروری ہے جن کی بنا پر نبوی راہنمائی سامنے آئی۔ شیخ غزالی کے نزدیک ایسی کوئی سنت نہیں جو قرآن حکیم کے کسی حکم



کے مخالف ہو۔

اسی کتاب میں شیخ نے ”السنۃ حق“ کے زیر عنوان واضح کیا ہے کہ جب کسی حکم کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ آپ ﷺ کا دیا ہوا ہے تو اس حکم کی اطاعت واجب ہے۔ یہ اللہ کی اطاعت ہے۔ کسی مومن کے لئے حکم رسول ﷺ سے سر تابی روا نہیں۔ یہ کہنا کہ قرآن شریف میں ہر چیز ہے لہذا سنت کی ضرورت نہیں ایک خطرناک بدعت ہے۔ ہم سخت رسول ﷺ کا انکار کر کے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ حدود الہی کیسے نافذ کر سکتے ہیں۔ ان سب کی تفصیل ہمیں صرف سنت سے ہی مل سکتی ہے۔

عملی متواتر سنتوں کا انکار، اسلام سے خروج ہے جب کہ محض اتباع خواہش کے لیے خیر واحد کا انکار نافرمانی ہے۔ سب احادیث، دنیا کے بہترین تاریخی وثائق ہیں۔ شیخ نے احادیث کے بارے میں ایک بہترین اصول پیش کیا ہے کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لئے صرف اس کے راویوں کا عادل ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس حدیث کا ثابت شدہ یقینی حقائق کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی حدیث میں کوئی شذوذ ہے یا علتِ قادح ہے تو اسے ”حدیث“ کہنا صحیح نہ ہوگا۔

## غزالی اور فقہ۔ غزالی کے تفقہ کے اصول

### (۱)۔ کتاب و سنت، ایک وقت۔ نصِ معصوم

یعنی قرآن و سنت۔ قرآن مصدرِ اول اور اصل الاصول ہے جب کہ سنت اس کی نظری وضاحت اور اس کی عملی تطبیق ہے۔ شیخ ہر ایسی ”حدیث“ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو قرآن کی نفیض ہو۔ ایسی روایت کی تاویل میں وہ کسی تکلف سے کام نہیں لیتے۔

## (۲)۔ مصالحِ مرسلہ کی رعایت

شیخ غزالی، مصالحِ مرسلہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی شرعی شروط کے ساتھ۔ جن میں پہلی شرط یہ ہے کہ مصالحِ مرسلہ نصِ صحیح سے متعارض نہ ہوں۔ ان کے خیال کے مطابق مسلم سیاستدار، مصالحِ مرسلہ سے اپنی نیت کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

## (۳)۔ جملہ مکاسبِ فکر کا احترام

شیخ غزالی تمام فقہی مذاہب کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ خواہ یہ متبوع ہوں یا غیر متبوع۔ وہ کسی بھی فقہی مسلک کے لیے تعصب نہیں رکھتے۔ آپ کے نزدیک تمام ائمہ مذاہب رسول، علم، تقویٰ، شجاعت، رائے اور صلاحیتِ حق میں کوہِ ہائے بلند ہیں۔ شیخ غزالی، ہمارے فقہی ورثہ کے دو مشہور مدرسوں یعنی مدرسۃ الاثر اور مدرسۃ الراء کا احترام کرتے ہیں۔ خود شیخ کا، اپنے اجتہادات میں رجحان زیادہ تر مدرسہ رائے کی طرف ہے۔ آپ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں تشکیل پانے والے تجدیدِ اسلامی کے مشہور متعصبِ فکر کی تعریف کرتے ہیں جو شیخ الاسلام ابنِ تہیہ اور ان کے تلامذہ کے ہاتھوں قائم ہوا تھا۔ آپ اسے ”مدرسہ موازنہ و ترجیح“ کا نام دیتے ہیں۔ شیخ غزالی مسائلِ طلاق میں ابنِ تہیہ کی آراء کو پسند کرتے ہیں اور انہیں عصرِ حاضر میں خاندانی ادارہ کے وجود کی حفاظت کے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔

## (۴)۔ فقہ دعوت کے لیے

شیخ غزالی اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے فقہ کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جزئی فقہی مسائل کو غیر مسلموں کو قبولِ اسلام سے جھڑکرنے اور گنہگار و بے راہ مسلمانوں کو توبہ و ہدایت سے روکنے کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ شیخ اہل علم کے لیے، ائمہ سابقین کی اندھی اور مطلق تقلید کو ناپسند کرتے ہیں۔ اہل علم کو اپنی علمی کوتاہی

کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اور اتنا علم حاصل کر لینا چاہیے کہ وہ فقہاء کے اقوال میں نظر و ترجیح کر سکیں اور اپنے زمانے اور ماحول کے لیے اجتہاد کر سکیں۔ شیخ غزالی ان لوگوں کی کوشش کو ناپسند کرتے ہیں جو ”اختلاف“ ختم کر کے لوگوں کو ایک رائے پر جمع کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ نظر و فکر کا اختلاف ایک طبعی امر ہے۔ جو صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی تھا۔ اس کوشش سے اختلاف ختم نہ ہو گا بلکہ اس کی شدت میں ضرور اضافہ ہو گا۔

## غزالی۔ ایک مصلح و مجدد

ابو داؤد نے اپنی سنن میں اور الحاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

”ان الله يبعث لهذه الامة على راس كل مائة سنة من يجدد لها دينها“

اللہ تعالیٰ، اس امت کے لیے، ہر صدی کے سرے پر ایسا شخص کھڑا کرے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا..... یہ ایک حقیقت ہے کہ چودہویں صدی ہجری کے سرے پر، اس دور میں تجدید اسلامی کے عمائدین میں سے ایک شیخ غزالی تھے۔ جنہوں نے اپنی کتابوں، مقالوں، خطبوں اور لیکچروں کے ذریعے اصلاح کی طرف دعوت دی۔ اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

### (۱)۔ تجدید ایمان و تزکیہ نفس

عقل و فکر کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ آپ تزکیہ نفس اور پاکیزہ تصوف اپنانے پر زور دیتے تھے۔ آپ دلوں میں جلال الہی کا احساس پیدا کرنے کے لیے اس کی عظمت کا نقش بٹھانے کے لئے ذکر الہی کو ضروری سمجھتے تھے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے آپ کی کتاب ”رکاز الایمان بین العقل والقلب“)

## (۲)۔ سیاسی استبداد کا مقابلہ اور حریت

سیاسی فساد کے بارے میں شیخ غزالی نے اپنی کتاب ”مہموم داعیہ“ میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ آپ کو ان حضرات کی رائے سے سخت اختلاف ہے جو حکمرانوں کو دین کا حق دیتے ہیں۔ آپ اسے اسلامی شورایت کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ آپ کے بھول اگر یہ شوری ہے تو پھر استبداد کس چیز کا نام ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ ہماری آئینی فقہ حجاج، عبید اللہ بن زیاد اور عبواس و آل عثمان کے کچھ بادشاہوں کی چھاپ سے محفوظ ہونی چاہیے۔

حکومتی اداروں اور ان کے اصول و ضوابط کی اصلاح کے لیے ذہین و متقی فقہاء کی ضرورت ہے۔ آپ کے نزدیک ہماری پسماندگی کا سبب آزادی کا ضیاع اور استبداد کا غلبہ ہے۔

## (۳)۔ عدل اجتماعی

شیخ غزالی کی نگاہ سب سے پہلے ظلم اجتماعی پر پڑی۔ آپ نے اپنے ماحول میں جاگیرداروں کے ظلم و ستم اور شاہی ٹولے کے غریب کسانوں پر روار کھے جانے والے مظالم دیکھے تھے۔ آپ نے دہلے پتلے غریبوں کے گوشت پر پلنے والے پھولے ہوئے موٹے پیٹ دیکھے تھے۔ مصر اور اسی قسم کے دیگر ممالک میں کتنے لوگ ہیں جو کام بہت کرتے ہیں مگر ان کی ملکیت میں کچھ نہیں اور کتنے لوگ بڑی بڑی املاک رکھتے ہیں مگر کام کچھ نہیں کرتے۔

غزالی اپنے دل و دماغ اور جذبات سے پسماندہ اور پے ہوئے طبقات کے ساتھ تھے۔ آپ کے نزدیک بے کار لوگ، دوسروں کی محنت پر پلنے والے اور وقت گزارنے کے لیے عیاشی کرنے والے بدترین مخلوق ہیں۔ سب سے پہلے شیخ نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا اور تین کتابیں لکھیں۔

## (۴)۔ عورت اور خاندان کی آزادی

حیات بھری کے قیام کے لیے عورت اور مرد دونوں جنسوں کا وجود ناگزیر

ہے۔ قبل از اسلام ہر دور اور ہر معاشرے میں عورت کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسلام نے اگر اس ظلم و جور کا خاتمہ کیا۔ عورت کے بارے میں قرآنی و نبوی تعلیمات کے باوجود، مسلمانوں نے اپنی تہذیبی و تمدنی پسماندگی کے دور میں اس پر ظلم روا رکھا اور اس کے بہت سے حقوق سلب کر لئے، اسے گھر کا قیدی بنا دیا۔ وہ دین و دنیا سے غافل ہو گئی۔ مسلمان عورت کی اس پست حالت کو بدلنے کے لیے شیخ الغزالی نے بھرپور جدوجہد کی۔ آپ نے تہذیب اسلامی کے دور انحطاط میں جنم لینے والی موروثی رسومات اور سامراجی ثقافتی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رسومات سے عورت کی گلو خلاصی کی کوشش کی۔

غزالی بطور داعی و مصلح، مفسر و فقیہہ حقوقِ نسواں کے پر جوش حامی اور اس کے محافظ ہیں۔ وہ عورت کو چار دیواری میں محصور کر دینے کے خلاف ہیں۔ ان کی رائے میں مسلمانوں نے اپنی پسماندگی کے دور میں عورت پر ظلم کیا حتیٰ کہ اسے مسجدوں میں جانے سے روک دیا۔ حالانکہ باجماعت نماز کا انسانی طرزِ عمل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مسجدوں میں ہونے والے درس اور وعظ اپنا الگ اثر رکھتے ہیں۔

عورتوں کو مسجدوں سے روک دینے کا عمل عہدِ صحابہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جب یہ حدیث پیش کی کہ

”لا تمنعوا اماء الله مساجد الله“

یعنی اللہ کی بیویوں کو، اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو (متفق علیہ حدیث ہے رولوی ابن عمر ہیں جیسا کہ اللتو لتو والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان نمبر 254 میں ہے)۔ اس پر ان کے ایک بیٹے نے کہا۔ ”والله نمنعنہن انھن یتخذنہ دخلاً“ ”اللہ کی قسم، ہم انہیں ضرور روکیں گے۔ انہوں نے اسے باہر نکلنے اور اظہارِ زینت کا ایک بہانہ بنا رکھا ہے۔“ اس پر ان کے والد محترم نے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہم انہیں ضرور روکیں گے۔ اللہ کی قسم میں تم سے

کبھی بات نہ کروں گا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ساری زندگی اس بیٹے سے بات نہ کی۔ (محمد الغزالی۔ الحق المروج ۲ ص ۱۱۸-۱۱۹) یہاں پر شیخ الغزالی کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے قہقہہ صحابی باپ کی روایت ترک کر دی اور ایک عاق و جاہل بیٹے کی رائے کی پیروی کی۔

حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کے لیے مسجد نبوی ﷺ کا ایک دروازہ مخصوص کر رکھا تھا آپ ﷺ انہیں پچھلی صفوں میں نماز ادا کرنے کے لیے کہتے۔ عورتوں کی صفیں، مسجد نبوی ﷺ میں رہیں عہد نبوی ﷺ میں اور خلفاء راشدین کے دور میں بھی۔ عورتیں فجر سے لے کر شام تک مساجد میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ نماز عیدین و جمعہ میں نماز پڑھنے اور خطبہ سننے کے لیے عورتوں کی شمولیت، شعائر اسلام میں داخل ہے۔ مگر افسوس کہ اسلام نے عورت میں جو انقلاب برپا کیا تھا وہ بدرجہا مٹ گیا۔ حتیٰ کہ عورتوں کو تعلیم سے روکنے اور ناخواندگی پر باقی رکھنے کے لیے یہ حدیث گھڑی گئی کہ عورتوں کے لیے ”لکھنا“ ممنوع ہے۔ مگر یہ نہ سوچا کہ اس جہالت کا اثر کس پر پڑے گا؟ اگر کسی قوم کی آدمی آبادی جاہل ہے تو انے والی نسلوں کا کیا حال ہوگا؟

عورتوں کو مسجد سے روکنے کے بارے میں صحیحین میں کچھ نہیں آیا۔ کسی ضعیف روایت کے ذریعے مشہور و متواتر عملی سنت کی مخالفت جہالت ہے۔ مسجدوں میں عورتوں کی حاضری سے فتنہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ تقویٰ و علم کی کھدائی ہوتی ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ عام معمول کا لباس پہن کر مسجد میں جائیں۔ اگر کہیں عورتیں زیب و زینت اور خوشبو و عطر کے ساتھ مسجد جاتی ہیں تو انہیں سمجھایا اور روکا جاسکتا ہے مگر عورتوں کے لیے مسجدوں کو ممنوع قرار دینے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵)۔ غلط فہمیوں کا ازالہ

اصلاح و تجدید کا اہم ترین مظہر جس پر شیخ غزالی کی فکر و نظر اور قلم و بیان نے بھر

پور توجہ دی وہ ہے اسلام کے بارے میں عوام کے غلط تصورات اور مغالطوں کی تصحیح۔ ان میں سے ایک عبادت کا غلط مفہوم بھی ہے۔ آپ ”مشکلات فی طریق الحیاء الاسلامیہ“ میں کہتے ہیں۔

آسمانی عبادات کی ادائیگی میں تقریباً آدھ گھنٹہ لگتا ہے۔ اس کے بعد باقی سارا وقت چتا ہے زندگی کو سمجھنے، اس کی قوتوں کی دریافت اور انہیں خدمتِ دین کے لیے بروئے کار لانے کے لیے۔ اس سلسلہ میں کی گئی ہر کوشش شرعاً، عملِ صالح، جہادِ مبرور اور اللہ کی رضا کے لیے انسان کو اپنے ایمان کی تکمیل کے قابل بنانا کھلائے گی۔ جس معاشرے کے لوگ دنیا سے نا آشنا ہوں، دنیا میں عاجز ہوں وہ معاشرہ کیسے اپنا مشن ادا کر سکتا ہے؟ ہم نے چند الفاظ کی ادائیگی اور چند مظاہر کے ثواب تک اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ زندگی کے میدانوں میں ہماری ناکامی کا اصل سبب یہی ہے اور ہم نے اس کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اگر ہم مسلمان لوہے، فولاد اور اس کے استعمال اور اس کی صنعت سے ناواقف ہوں تو ہمارا سورۃ الحديد کی اس آیت پر ایمان ناقص ہو گا جس میں اللہ نے لوہے کو اتارنے اور اس کے فوائد کا ذکر کیا ہے۔

## (۶)۔ اسلام کا متوازن جامع نظریہ

شیخ الغزالی، اسلام کے جزئی تصور کو ناپسند کرتے ہیں وہ اسلام کا کلی مفہوم اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق سب سے پہلے خوارج عقلی کی یا فقہی کم فنی میں مبتلا ہوئے، خارجیوں نے کہا۔ ”حضرت علیؓ کے خلاف لڑائی کرو یا پھر وہ حکم سے بری الذمہ ہو جائیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے خلاف اس وقت تک لڑو جب تک وہ اپنے بزرگوں یعنی خلفاءِ ہمامیہ پر لعنت نہیں بھیجتے۔“ یہ فقہی کو تاہ نظری نتیجہ ہے اس بات کا کہ فقہاء فخرِ ثاقب رکھتے ہیں مگر قلوبِ عابدین نہیں۔ صوفیاء کے جذبات پاکیزہ ہیں مگر ان کے پاس فقہاء جیسی عقلیں نہیں ہیں۔ محدثین کو احادیث کے متن یاد ہیں مگر وہ ان احادیث کو ان کے اصل مقام

پر رکھتے ہیں نہ ان سے صحیح طرح سے استنباط کر سکتے ہیں۔ اصحابِ رائے کو مصلحتِ نظرِ آتی ہے مگر نصِ محفوظ سے اس کی تائید لانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کا فرض، عوام کے لیے، عوامی مفاد کے لیے کام کرنا ہے مگر تقویٰ میں ان کا دامن تنگ ہوتا ہے۔ عوامِ انفرادی عبادات میں مصروف رہتے ہیں مگر جب نصیحت اور امر و نہی اور حکام کے غیض و غضب کو برداشت کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ چپ سادھ لیتے ہیں۔ نماز، سچائی اور نظافت سکھاتی ہے مگر مسلمان غیر منظم اور پراگندہ ہیں۔ حج کا سفر دلوں کو کباب کرتا اور سکون و رحمت کا درس دیتا ہے مگر لوگ حج کی ادائیگی کے دوران اور اس کے بعد سنگ دلی اور بد مزگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

### (۷)۔ امت کی آزادی اور اتحاد

شیخ غزالی کے نزدیک اہم اصلاحی پہلوؤں میں سے ایک امتِ اسلامیہ کو ہر اس اقتدار سے آزاد کرانا ہے جو اس کے فکر و ارادہ کو شل کر دے۔ اسی لیے آپ نے ہر طرح کے سامراجی غلبہ و تسلط کی مخالفت کی۔ ہمارے اندر موجود سامراج کے ایجنٹوں سے فکر لی۔ مسئلہ فلسطین کی ہر طرح سے تائید و حمایت کی۔ مسلمانوں کو تمام باہمی اختلافات بھلا کر، غاصبِ یہودی کے خلاف سینہ سپر ہونے کی دعوت دی۔ اسرائیل اور دنیا بھر کے یہودیوں کی منصوبہ بندی اور ان کی چالوں کو سمجھنے اور اس کا توڑ کرنے کے لیے کہا۔ شیخ غزالی نے آزادی کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیا۔

### (۸)۔ امت سے کٹے ہوئے گروہوں کا انضمام

امتِ اسلامیہ سے کٹے ہوئے فرقوں کو امت میں ضم کرنے کے بارے میں آپ نے دعوت دی۔ آپ فرماتے ہیں :

”امتِ اسلامیہ میں اب بھی ایسے کئی فرقے پائے جاتے ہیں جو ہمیں باطنی مذاہب



اور ان کے داخلی فتنوں کی یاد دلاتے ہیں..... یہ لوگ ہزار سال سے چلے آ رہے ہیں۔ جیسے نصیر یہ، دروز، اسماعیلی (الغافانی) اور اس قسم کے دیگر چھوٹے چھوٹے فرقے جو اسلام کی طرف منسوب ہیں۔ یہ اپنے آپ کو شیعہ مسلم سمجھتے ہیں جبکہ جمہور شیعہ ان سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ یہ دراصل باطنی خاندان ہیں جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ یہ چند بے سند افکار سے چٹھے ہیں۔ میرے خیال میں یہ مملکت اور امت دونوں کی بے توجہی اور عدم دلچسپی کا نتیجہ ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ اتنی طویل صدیوں کے بعد بھی یہ لوگ دارالاسلام میں یوں الگ تھلگ رہ رہے ہیں۔ ایک ہزار سال سے زائد مدت ہو چکی ہے مگر حکومت اسلامی نے ان لوگوں کی تالیفِ قلب کر کے انہیں اپنے اندر ضم نہیں کیا؟ یہ نہ امت کے ساتھ ہیں نہ اس کے دشمن ہیں۔ باطنی، عوام اور حکومت کے مابین پائے جانے والے خلا سے پیدا ہوئے ہیں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے باطنی فکر کو مٹانے اور ان کی خرافات واضح کرنے کی نمایاں کوشش کی۔ عوام کی اکثریت کو ان سے الگ کر دیا۔ اس طرح ان کی سیاسی قوت کا بالکلیہ خاتمہ کر دیا۔ مسلمان حکمرانوں نے... جو زیادہ تر جاہل و جاہلہ تھے..... اپنی فکری بے بضاعتی کی وجہ سے مجاہد علماء کے اس شروع کیے ہوئے کام کو اس کے منطقی نتیجہ تک نہیں پہنچایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان فرقوں کی طرف منسوب عام لوگ اب اپنے قدیم سرچشموں سے کٹ چکے ہیں لہذا اب اسلام کی طرف ان کا رجحان زیادہ قوی ہے۔ اہل اسلام کو مسلسل تعلیم اور ذرائعِ بلاغ سے کام لے کر ان فرقوں کو کتاب و سنت کے پرچم تلے لانے کی بھرپور کوشش کرنا چاہیے اور ان کے افراد کو وسیع قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے۔

(۹)۔ پسماندگی سے نکلنے اور ترقی کی طرف بڑھنے کی دعوت

شیخ غزالی نے جس بات پر بھرپور توجہ دی وہ تھی امت کو پسماندگی کے دائرہ سے

نکال کر انسانی ترقی کے کارواں میں شریک کرنا۔ پس ماندگی اس امت کا دھیرہ ہے نہ اس کی دینداری کا مظہر۔ بلکہ یہی امت تو تقریباً ایک ہزار سال تک پوری دنیا میں سر بلند رہی ہے۔ اس کی تہذیب ہی غالب تھی اور اس کے علماء ہی علم و فکر کی ہر شاخ میں، دنیائے قدیم میں راہنمائی کرتے رہے ہیں۔

## اسبابِ زوالِ امت

شیخ غزالی نے ایک کتاب... سر تاخر العرب والمسلمین (عربوں اور مسلمانوں کے زوال کا راز) لکھی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اسلامی تہذیب اور امتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب بیان کئے ہیں۔ جو مختصر ایہ ہیں۔

(۱)۔ اسلام کو غلط سمجھنا۔ جسے مؤخر کرنا چاہئے اسے مقدم کرنا اور جسے مقدم کرنا چاہئے اسے مؤخر کرنا۔ دین کے نام پر خرافات کا پھیلاؤ۔ جیسے مصیبت کے وقت، سنت کے مطابق اسباب اختیار کرنے کے بجائے عاری شریف کا ختم کرنا۔

(۲)۔ اسلامی تعلیم میں بہت بڑا خلل پیدا ہونا۔ اسلامی تعلیم ہی امت کی فکری و روحانی غذا ہے یہی اس کے عقل، ذوق اور ارادے کو بڑھاتی ہے۔

(۳)۔ مسلمانوں کی دنیا سے بے خبری۔ حالانکہ ہمارے اسلاف کے یہاں دنیا کا وسیع علم تھا اور اس پر مکمل عبور تھا۔

(۴)۔ عالمِ اسلام میں تقدیر کے نظریہ جبر کا پھیلاؤ۔ یعنی انسان پاہند ہے آزاد نہیں۔ انسان قدرت و ارادہ اور اختیار و قوت سے محروم ہے۔ اس کا سبب شیخ کے نزدیک علم الکلام، علم التصوف اور قرآن و حدیث کے کچھ مفسرین و شارحین ہیں۔ مزید برآں اسباب و مسببات کے مابین رابطہ کا کمزور ہونا۔ کراماتِ اولیاء اور خارقِ عادت نظریہ کا فروغ۔

(۵)۔ اسلامی معاشرے میں ریاء کی رسومات، مسلمانوں نے بہت سی رسومات اپنا محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

رکھی ہیں جو محض نمود و نمائش پر مبنی ہیں اور اسلام کے آسان، سادہ فطری انداز سے ہٹی ہوئی ہیں۔

(۶)۔ عورت کی کم زور پوزیشن۔ ایک جھوٹی حدیث کی بنا پر عورت کو تعلیم سے روک دیا گیا۔ ”انہیں لکھنا نہ سکھاؤ۔“ ایک اور من گھڑت روایت ہے۔ ”نہ عورت کسی مرد کو دیکھے اور نہ اسے کوئی مرد دیکھے۔“ متواتر صحیح سنتوں کے علی الرغم عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روک دیا گیا۔ اللہ کے گھروں کو ان سے غیر کباد کر دیا گیا۔ وہ دینی راہنمائی سے، قرآن و حدیث اور فقہ سے محروم رکھی گئیں۔ یوں مسلمان عورت کا دین اور معاشرے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی پورے عالم اسلام میں تربیت کا معاملہ دیگر گوں ہو گیا۔

(۷)۔ ادبِ عربی میں انحطاط۔ شیخ غزالی کے نزدیک شعر و نثر میں انحطاط بھی مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب ہے۔ عربی ادب میں ضعف پیدا ہونے کی وجہ سے اعلیٰ ادیب، مؤلف اور مفکر کم ہو گئے۔

(۸)۔ معاشرے میں غلط مالی پالیسی۔ اسلامی معاشرے میں مال کے غلط استعمال سے غربت و مالداری دونوں انتہا کو پہنچیں۔ حالانکہ اسلام وہ دین ہے جس نے خلیل مالداریوں سے، غریبوں کے حقوق لینے کے لئے اپنی فوجوں کو حرکت دی۔ مگر افسوس کہ حکمرانوں نے اس پہلو پر توجہ نہ دی۔ غریب عوام کو ظلم و بد حالی سے دوچار ہونا پڑا۔ رشوت، بے کاری اور بے روزگاری کا عام چلن ہو گیا۔

(۹)۔ سیاسی نگاہ۔ حدیث میں ہے اذا وُسِّدَ الامر الی غیر اہلہ فانظر الساعة۔ جب معاملہ کو نااہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ مگر افسوس کہ یہاں معاملات کو اہل لوگوں کے سپرد نہ کیا گیا۔

## (۱۰)۔ ثقافت اور اسلامی ورثہ کی تطہیر

مسلمان جس طرح زندگی کا سامنا کرتے ہیں شیخ کے نزدیک اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ مسلمان بہت سے ان امور سے ناواقف ہیں جن کا جاننا ان کے لئے ضروری ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں ان کا علم ناقص ہے، تقلیدی تعلیم اس کی ذمہ دار ہے۔ اس تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

(الف)۔ مسلمانوں کی روایتی تعلیم میں ماوراء مادہ میں دلچسپی لی گئی ہے۔ حالانکہ الوہیت کی بنیاد کو سمجھنا اور ذات و صفات کے تعلق کو جاننا انسان کے بس کا روگ نہیں۔ حقیقت روح کا ادراک ناممکن ہے۔

(ب)۔ غیر ضروری عہدیں۔ طہارات و صلوٰت میں غیر ضروری طویل تشریحات سے مسلم علماء کی عمریں انہی جزئی امور میں کھپ گئیں اور زندگی کے دیگر معاملات سے وہ غیر متعلق ہو کے رہ گئے۔

(ج)۔ دینی تعلیم پر کم توجہ۔ دینی تعلیم صرف غریبوں کے بچے حاصل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ”علماء“ بن کر، زندگی کے مختلف میدانوں میں قوت و جرأت کے ساتھ قیادت نہیں کر سکتے۔ وہ جلدوں اور گنہ گاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ علماء کی ایک بہت بڑی تعداد ایمان کے کم زور ترین درجہ (منکرات کو صرف دل سے برا سمجھنے) میں ہوتی ہے۔ جب کہ اس سے بڑی تعداد سیاستدانوں اور حکمرانوں کی پیروی کرتی ہے، اُن کا دیا کھاتی ہے اور ان کے کرتوتوں پر خاموش رہتی ہے۔ جب علماء اور حکمران ہی خاموش ہو جائیں تو امت کب راہِ راست پر چل سکتی ہے۔

(د)۔ مطالعہ تاریخ میں کوتاہی۔ شیخ غزالی کے نزدیک کسی بھی علاقے کے مسلم عوام کا مطالعہ، اہم و واجب ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”مسلمان امت واحد ہیں مگر میں نے اپنی ازھری

تعلیم کے پندرہ سالوں میں جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں حتیٰ کہ جنوبی ایشیا کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں پڑھا۔ نہ ہی جدید دور میں شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کی حالت کے بارے میں کچھ پڑھا۔ انڈونیشیا کے جزیروں پر ہالینڈ کے استعمار اور سولو، منڈناؤ اور دیگر ان تمام جزیروں کے بارے میں (جن کا نام بعد میں فلپائن رکھا گیا) جن پر، سپانوی سامراج نے قبضہ کیا ہمیں کچھ پتہ نہ تھا۔ فرانسیسیوں نے ہند چینی کے علاقے کو کیسے اپنی کالونی بنایا؟ فطانی، ملایا اور سنگاپور میں مسلمانوں پر کیا بیسی؟ ہم ان سب باتوں سے نا آشنا رہے۔ یہ بات واضح ہے کہ تاریخ اسلامی کا ہمارا مطالعہ بہت کم زور ہے جب کہ تاریخ انسانی کا ہمارا مطالعہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ آنحضرت ﷺ کا پیغام تمام براعظموں کے لئے ہے۔ ہم مسلمان ان براعظموں سے کیسے ناواقف رہ سکتے ہیں۔ ان کے باشندوں، نسلوں، مذہبوں اور فلسفوں سے کیسے بے گانہ رہ سکتے ہیں؟ زبان سے کہنا کہ ہمارا مشن عالمگیر ہے مگر دنیا کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہ کرنا عجیب تضاد ہے۔

(۵)۔ فقہ اور واقعی صورت حال کو سمجھنے میں کوتاہی۔ علم اصول فقہ ہماری فکر اور اصالت بحث و تحقیق پر دلالت کرتا ہے۔ یہ خالص شاندار اسلامی فکری پیداوار ہے۔ ہمیں اصول فقہ کو محض قیل و قال کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے بلکہ اسے قانون سازی کے لئے بروئے کار لانا چاہیے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اصول فقہ کی جو تجدید کی ہے وہ بھی ہمارے مد نظر رہے۔ دوام تو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو ہے نہ کہ بشری اجتہاد کے لیے۔

(۶)۔ علوم کائنات اور انسانی علوم میں کوتاہ دامنی۔ کائنات اور انسان کے متعلق علوم میں ہماری کوتاہ دامنی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ شیخ غزالی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ شخص قرآن کریم کی عظمت کیسے سمجھ سکتا ہے جس نے علوم ارضی کا مطالعہ نہیں کیا۔ جدید علوم سے کنارہ کشی کر کے دینی عقل کی تشکیل و تکمیل نہیں ہو سکتی۔

(ز)۔ صوفیانہ لڑچکر کی چھان پھٹک۔ اس سلسلے میں شیخ کی رائے ہے۔ ”اگر ہم صوفیانہ لڑچکر کی چھان پھٹک کریں۔ لکن القسم، لکن الجوزی، امام غزالی، لکن عطاء اللہ اسکندری وغیرہ حضرات کی کاوشوں کی قدر کریں تو اخلاق اور تربیت و سلوک میں ہمارے پاس گراں قدر سرمایہ ہو گا جس کی مدد سے ہم نصف علوم انسانی کو خوبصورت اور مفید اسلامی قالب میں ڈھال سکیں گے۔ کچھ حضرات نے تصوف کو علم سمجھنے سے انکار کیا ہے اور مسلم عوام کو پیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر یہ کوتاہ بین افراد یہ رویہ اختیار نہ کرتے تو خشک فقہاء سے کہیں بہتر عوام کی قیادت کرتے۔ پاکیزگی نفس، طہارت قلب و نظر اور غفود و رگزر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہوتے۔ تصوف سے انکار دے رخی کا یہ موقف کب تک رہے گا؟ ہمیں اس موقف سے کیا ملا؟ دین کا جو ہر اس وقت مفقود ہو جاتا ہے جب اس کا دل سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ علم قلب یا علم سلوک کے تمام مراحل اسلامی تصوف میں پائے جاتے ہیں۔

## (۱۱)۔ اسلامی بیداری کے لئے راہنمائی

شیخ محمد الغزالی نے اسلامی بیداری پر بہت زور دیا ہے تاکہ مسلمان اپنی عظمت رفتہ کو پھر پاسکیں۔ اپنے داخلی و خارجی موانعات سے بچ سکیں۔ آپ اس کے لئے درج ذیل اقدامات تجویز کرتے ہیں۔

(اول)۔ محبت و تعلق صرف اسلام سے ہو۔ اسلام کی طرف نسبت معذرت

خواہانہ نہ ہو بلکہ علانیہ ہو۔

(دوم)۔ ہم اپنے عقائد، شعائر اور شرائع سے والہانہ عقیدت رکھیں اور ان کے

اظہار میں نہ ہچکچائیں۔

(سوم)۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں کی خوشامد میں مصروف، فروغی اختلافات

میں جتلا، نظری مسائل میں الجھنے اور الجھانے والے، ظلم و استبداد کے حامی علماء کو نظر انداز کیا جائے اور انہیں لعنت کا اتحاد پارہ پارہ نہ کرنے دیا جائے۔

(چہارم)۔ اسلامی جماعتوں کو ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔

(پنجم)۔ چھوٹوں کو بڑوں پر تنقید نہیں کرنا چاہیے۔ شیخ لکھتے ہیں۔ ”میں مذہبی تہصّب کو سخت ناپسند کرتا ہوں اور اسے علم و عقل کی کمی سمجھتا ہوں یا اخلاق و مروت میں کوتاہ دامن پر محمول کرتا ہوں۔ میں مذہبی تقلید کو عوام کے لئے اور کائناتی علوم، زندگی اور دنیاوی علوم کے ماہرین کے لئے مستحسن سمجھتا ہوں۔ البتہ تقلیدی دینی علوم میں مشغول حضرات کے لئے بہتر ہے کہ وہ مختلف نقطہ ہائے نظر میں موازنہ کریں اور ایک دلیل کو دوسری دلیل پر، ایک مسلک کو دوسرے مسلک پر ترجیح دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسلاف کا احترام کریں۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ آپ کی ہر بات بھی تسلیم کروں۔ اگر میں کسی کی رائے کو غلط قرار دیتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس رائے والے صاحب سے افضل ہوں۔“

(۱۲)۔ عربی زبان کا احیاء

امام شافعیؒ کے نزدیک عربی زبان..... یا اس کی کم از کم اتنی مقدار.... سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے تاکہ وہ اپنے دینی فرائض بالخصوص نماز سرانجام دے سکے۔ دنیا میں اسلام کے پھیلاؤ کا ایک سبب عربی زبان کا پھیلاؤ تھا مگر تہذیب اسلامی کے دور انحطاط میں عربی زبان و ادب کمزور ہوئے حتیٰ کہ 80 یا 85 فی صد مسلمان عربی سے نا آشنا ہو گئے۔

عربی زبان کے احیاء و فروغ کے لئے یہ کام کرنے ضروری ہیں۔

(۱)۔ دینی علوم کی تعلیم سے الگ صرف عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے لئے وفد و

اور جماعتیں تیار کی جائیں۔ اس اقدام سے اسلام کو دور رس فوائد و ثمرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ملیں گے۔

(۲)۔ دنیائے عرب میں عامی لہجوں کے خلاف بھرپور جنگ کی جائے۔  
فصح زبان کو فروغ دیا جائے۔ عامی لہجوں میں پروگرام پیش کرنے پر پابندی  
لگائی جائے۔ آزاد شاعری کو ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳)۔ خالص عربی ادب کا احیاء کیا جائے اور اسے عصر حاضر کے مزاج کے  
قریب کیا جائے۔ یعنی اسے تکلف اور محسناتِ لفظی سے پاک کیا جائے۔  
عمدہ شاعروں کی مختلف ذرائع سے حوصلہ افزائی کی جائے۔

(۴)۔ عربی زبان کے بورڈ، تہذیبی الفاظ کے پھیلاؤ اور عربی کو جدید علوم کی زبان  
بنانے کے لئے گراں قدر اقدامات کریں۔

اس مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شیخ محمد الغزالی ایک عظیم مفکر اور بلند  
پایہ آزاد منش عالم دین تھے۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی  
تھی۔ آپ نے اپنی سوچ، دل، زبان، قلم، جہاد اور اجتہاد اسلام کی نذر کر دیا تھا۔ آپ نے اسلام  
کے پرچم تلے سب معرکے لڑے۔ جاہلیتِ خواہ کسی نام سے آئے، کسی عنوان سے آئے، آپ  
نے اس کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ شیخ غزالی دینِ اسلام کے ایک بیدار مغز محافظ  
تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ ان کے اعمالِ حسنة کو قبول فرمائے اور انہیں  
صالحین کے زمرہ میں شامل فرمائے۔ (آمین)



## شیخ محمد الغزالی کی خود نوشت سوانح حیات

### بچپن کی یادیں

کوئی ہم سے یہ نہیں پوچھتا کہ ہم کیوں کسی خاص علاقے یا زمانے میں پیدا ہوئے؟ کسی خاص علاقے یا کسی خاص زمانے میں پیدا ہونا، ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ یہ قدرت کے اٹل فیصلے ہوتے ہیں جن میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میں تاریخ اسلام کے ایک انتہائی رسوا کن دور میں پیدا ہوا۔ یہ نہایت کٹھن دن تھے۔ انگریز مصر پر قابض تھے۔ انہوں نے دنیائے اسلام کے ایک وسیع و عریض رقبے پر قبضہ جمار کھا تھا۔ ان افرودہ حالات میں، شکست خوردگی کے باوجود پرانی اور نئی نسل کے لوگ چپ سادھے چپکے نہیں بیٹھے رہے۔ قابض برطانوی حکام کے خلاف نفرت قومی سطح پر موجود تھی۔ مزاحمت جاری تھی۔ کسی نے بھی سر تسلیم خم نہیں کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے چھوٹے سے گاؤں ”کلا العنب“ ضلع البحیرہ نے بھی انگریزوں کے خلاف ”بغاوت“ میں بھرپور حصہ لیا۔ گاؤں کے لوگوں نے ٹیلیفون کی تاریں کاٹ ڈالیں اور رسول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ قابض فوج کی ایک یونٹ آئی۔ فوراً کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ یہ یونٹ مسجد کے سامنے صف آراء ہو گئی۔ لوگ گھروں میں چھپ گئے۔ کچھ کسانوں نے کرفیو کے احکام کی خلاف ورزی کی تو انہیں گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ آج تک یہ سانحہ میری یادوں کے خزانے میں محفوظ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میری ماں نے مجھے اپنے کندھے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ہم دور چھت پر تھے اور پیش قدمی کرتی ہوئی گورافوج کو دیکھ رہے تھے۔ میں اس وقت تین سال کا تھا۔ میں 22 ستمبر 1917ء کو پیدا ہوا تھا جب کہ یہ جنگ آزادی 1920ء میں رونما ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ نہیں، ایسی بات نہیں۔ میرے

حافظے کا تو یہ عالم ہے کہ کبھی چند منٹ پہلے کی بات بھول جاتا ہوں اور کبھی بیسیوں سال پہلے کا واقعہ یاد رہتا ہے۔

میں پرائمری اسکول میں تھا کہ گرائمر (نحو) کے استاد نے مجھے حکم دیا۔ ”ہیٹا! رایت اللہ اکبر کل شنئی کی ترکیب نحوی (Analysis) کرو۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔ رایت فعل اور فاعل ہے۔ لفظ اللہ منصوب علی التعظیم ہے۔ لڑکوں نے شور مچایا تو میں نے سہم کر استاد کی جانب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ استاد صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ استاد محترم ایک خوف خدا رکھنے والے شخص تھے۔ ان کا دل خشیعہ الہی سے لبریز تھا۔ وہ یہ جان کر آبدیدہ ہوئے تھے کہ میں نے لفظ الجلالۃ کے ساتھ احترام و ادب کا رویہ اپنایا تھا۔ میں نے دوسرے لڑکوں کی طرح یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ مفعول اول ہے۔ بس یہی سوچ کر ان کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔

یہ واقعہ آج سے ساٹھ سال بلکہ اس سے بھی پہلے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ استاد محترم پر رحم فرمائے اور ان کے درجات مزید بلند فرمائے۔ میرے حافظے کا یہی حال ہے، کچھ چیزیں اس میں ایسی زبردستی گھسی بیٹھی ہیں کہ گردشِ شب و روز سے بھی وہ بھولتی نہیں۔ کئی باتوں کو یاد کرتا ہوں تو حافظے سے یوں دور بھاگتی ہیں گویا کہ وہ باتیں سرے سے ہوئی ہی نہیں۔

میں جس صدی میں پیدا ہوا یہ ہمارے دین اسلام کی بدترین صدی تھی۔ میں ابھی سات سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ترکی مرتد مصطفیٰ کمال نے ”خلافتِ اسلامیہ“ کو سمندر میں پھینک دیا تھا۔ جی ہاں خلافت کا یہ ادارہ ایک جسدِ بلا روح بن چکا تھا۔ تاہم یہ ”جسد“ بھی دشمنانِ اسلام کو خوفزدہ کئے ہوئے تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر اس جسد بے روح پر ربر لبر ضربیں لگتی رہیں تو کہیں واقعی یہ زندہ نہ ہو جائے۔ کہیں یہ یکدم میدانہ ہو جائے اور اپنی خطرناک سرگرمی پھر سے شروع نہ کر دے۔ اسی لئے دشمنانِ اسلام نے اس کی ”موت“ کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں بڑا ہوا، لکھا پڑھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میری ولادت کے وقت جن حالات سے امتِ اسلامیہ دوچار تھی اس میں عوام بے بس تھے۔ یہ سب ہمارے حکمرانوں کی شلستِ اعمال کا نتیجہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسی قسم کے روح فرسا حالات میں لہٰذا تھیہ پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے، وہ عباسی حکومت کے سقوط کے وقت جوان تھے۔ تاتاری فوج کی یلغار جاری تھی۔ لہٰذا تھیہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک شہر سے بھاگ کر دوسرے شہر چلے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے زد و دست ناکامیوں، نقصانوں اور شکستوں کا سامنا تھا۔

مسلم اقوام نے ہمیشہ اپنے حکام کی بے اعتدالیوں کے نتیجے میں مصائب و آلام کا مزہ چکھا ہے۔ حکمران جو اپنی ذمہ داریوں کو صحیح ادا نہیں کرتے، جو اپنی امانتوں کو ضائع کرتے ہیں۔ اس میں ہمارا یعنی عوام کا کیا قصور؟ ہم جن کا کیا قصور؟ ہمارے ان بڑوں کا کیا قصور؟ جو اسلام کے شیدائی ہیں اور جو جان و مال اور نفس و نفیس کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔

## مکتب کی زندگی

میں گواہی دیتا ہوں کہ میرے والد مرحوم ایک عابد، متقی، محنت کش اور جفاکش انسان تھے۔ میرے والد نے میرا نام ”محمد الغزالی“ رکھا کیونکہ امام ابو حامد غزالیؒ نے ایک سچے خواب میں انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ خواب انہوں نے شادی سے پہلے دیکھا تھا۔ میرے والد مجھ میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں پانچ برس کا ہوا تو مکتب (کتاب) میں دوسرے بچوں کے ساتھ قرآن شریف حفظ کرنے لگا۔ میرے والد چونکہ خود حافظِ قرآن تھے۔ اس لیے انہوں نے مکتب کے ملاؤں کے ساتھ تعاون کیا تاکہ میرا وقت ضائع نہ ہو۔ والد چاہتے تھے کہ میں نہایت مختصر مدت میں قرآن شریف حفظ کر لوں۔

میں نہ تو کندہ نا تراش کند ذہن لڑکا تھا اور نہ حد سے زیادہ ذہین و فطین نابغہ روزگار

ہو نہار بروں میں اوسط ذہانت والا چہ تھا، کم زور و ناتواں، پست قد۔ ادھر مجھ سے پڑھنے میں غلطی ہوتی تو ادھر میرے جسم پر زور کا ڈنڈا پڑتا بلکہ برستا۔ میں اس ڈنڈے سے بہت ڈرتا تھا۔ بعض اوقات تو میں ڈر کے مارے ہچکچا جاتا۔ میں غلطی کرتا، استاد صاحب ڈنڈا اُپر اٹھا لیتے، میں جلدی سے اپنے حافظے کو بیدار کرتا، آیات کو پھر سے پڑھنے لگتا تو میں صحیح پڑھ کر مارے بچ جاتا بصورت دیگر ایک ہلکی سی ضرب میرے ناتواں جسم پر پڑ کے رہتی۔

یہ مکتب عجیب سا تھا۔ اس کی یاد مجھے پریشان کرتی ہے۔ ایک ہی بڑا سا کھلا ہال۔ مختلف عمروں کے تقریباً ایک سو بچوں سے بھرا ہوا۔ چھ سال سے لے کر 16 برس کی عمر کے بچے یہاں پڑھتے تھے۔ ہر چھ ایک لکڑی کی تختی پر جھکا ہوتا۔ وہ اس پر لکھتا یا لکھے ہوئے کو پڑھتا۔ ذرا بڑی عمر کے بچے براہ راست قرآن شریف سے پڑھتے۔ ان کو یہ سہولت اس وقت ملتی جب وہ ”لکھائی کا مرحلہ“ مکمل کر لیتے۔

تلاوت کی گونج 100 گز کے فاصلے سے سنائی دینے لگتی۔ کبھی کبھی اس گونج کو کسی مضروب کی چیخ چند لمحوں کے لئے کاٹ دیتی جو حسنِ اداہنگی میں کسی کوتاہی کا مرتکب ہوا ہو تا اور پھر عصارہ دگی کے درد سے چلا اٹھتا۔

بچوں کے باپ، مکتب میں اگر اساتذہ کو سمجھاتے کہ وہ تعلیم و تربیت کے معاملے میں ان کے بچوں پر شفقت نہ کریں۔ اس لیے کہ ان کے بھول ”استاد کا عصا جنت میں سے آیا ہوتا ہے۔“ ”عصی الفقیہ من الجنة۔“

## حفظِ قرآن کیوں؟

میں نے بڑے ہو کر اس ”طریقہ تعلیم“ کے بنی بر حقیقت ہونے کے بارے میں اپنے آپ سے پوچھا مگر میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکا۔ کچھ لوگ ”حفظِ قرآن“ کے مخالف ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ بچوں کو ایسے الفاظ رٹانے سے جنہیں وہ سمجھتے نہیں ان کی عقلی ترقی

اور ذہنی بڑھوتی معطل ہو کے رہ جاتی ہے۔ مگر میں نے ان اعتراض کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ بچوں کے ذہنوں کو لایعنی اور بے اصل خیالات سے بھر دیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو ٹیلی ویژن اور دوسرے بھری ذرائع پر ایسے پروگرام دکھاتے ہیں جن میں جوعوں، پریوں، بھوتوں وغیرہ کی داستانیں اور اسی قسم کی دیگر خرافات بھری ہوتی ہیں۔ یہ لوگ بچوں کو اسی قسم کی وڈیو فلمیں لاکر دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بچے کے حافظے کو ایسی چیز سے بھر دینا جو مستقبل میں اس کے کام آنے والی ہو، اس سے بہتر ہے کہ اس کے دماغ کو متحرک وہی تصویروں اور گھٹیا قسم کی کہانیوں سے پر آگندہ کیا جائے۔

اس الزامی جواب کے باوجود یہ اعتراض اپنی جگہ موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن شریف کے الفاظ کو رٹ لینے اور سینوں میں اس کی آیتوں کو محفوظ کر لینے کا کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے؟ جب کہ صرف حفظ ہی ہو اس کے ساتھ قرآن میں تدبر ہونہ تھک، نہ غور و فکر۔ اس کا جواب تو اثبات میں ہے کہ قرآن شریف کی قراءت متواتر و مسلسل ہے، جب کہ دیگر آسمانی صحیفے ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ بات ہے بھی حقیقت! قرآن کریم کے حفظ کے اتنے قوی انتظامات ہیں کہ یہ حفاظت در حفاظت میں ہے۔ اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوا، تاہم اس ضمنی فائدے کے باوجود حفظ کا عمل مقصود بلذات نہیں ہے۔ عمارت کو باقی رکھنا مطلوب ہے معنی کی زندگی کی بھائی خاطر اور اس کی ترقی کے لیے اور اس پر عمل کرنے کی خاطر۔ اس کی بنیادوں پر تہذیب و تمدن قائم کرنے کے لئے۔ مگر ان مقاصد عالیہ کو تو اختیار نہ کیا جائے اور صرف قرآن شریف کے الفاظ کو محفوظ کیا جائے تو اس حفاظت کا کیا فائدہ؟

## نظامِ مکتب کی اصلاح و تجدید

مکتبوں (کتاب) کا نظام اب تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ اسکولوں نے لے لی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہے۔ ان اسکولوں میں قرآن شریف کی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسلامی اور عربی تعلیم و تربیت کے سوتے خشک ہوا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کاش تھوڑے تھوڑے دقتے سے ایسی کافر نسیم ہوتی رہیں جن میں ان مکتبوں کی خوبیوں کو باقی رکھنے اور ان کی خامیوں کو دور کرنے، نئی نسلوں کو، ان کے اصول و آداب اور اقدارِ عالیہ سے روشناس کرانے کے بارے میں فیصلے ہوتے رہیں۔

میں مصائب ”میں دس برس کی عمر تک پڑھتا رہا۔ میں نے قرآن مجید مکمل حفظ کر لیا۔ نیز ریاضی کے ابتدائی اصول بھی سیکھ لئے۔ کچھ قواعدِ املاء کے بھی سیکھے۔ اب میرے والد محترم نے فیصلہ کیا کہ میں تعلیم کا اگلا مرحلہ شروع کر دوں۔

## ابتدائی تعلیم

اب مجھے اپنے ضلع ”البحیرۃ“ کے لیے مخصوص ازہری ادارے میں داخلہ لینا تھا۔ یہ ادارہ اسکندریہ شہر میں واقع تھا۔ دس سال کی عمر کا چھ تہا نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس کا خاندان بھی اس کے ساتھ منتقل ہو۔ چنانچہ والد محترم نے وہ دکان بھی بیچ ڈالی جو ان کی کمائی کا واحد ذریعہ تھا۔ آپ نے اسکندریہ کے محلہ کرموز میں کتبوں کی ایک دکان خرید لی۔ والد اس دکان میں اسٹیشنری، ترجمہ شدہ ناول، سکولوں کی کتابیں، علمی کتابیں، عوامی داستانیں اور مختلف مذہبی کتابیں فروخت کرنے لگے۔

یوں ہمارا خاندان اسکندریہ چلا آیا۔ اس میں میرے ساتھ دو افراد اور تھے، ان کے علاوہ، جو بچہ پارے، اسکندریہ کے قیام کے دوران فوت ہو گئے۔ اب محنت اور جدوجہد کا ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ گاؤں کی بد سکون زندگی کو چھوڑ کر، شہر کی ہنگامہ خیزی میں رہائش پذیر ہونے کے نقصانات کا مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا۔ میرے والد محترم نے تکلیفوں، رکاوٹوں اور سختیوں کے بحر انوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ شکست کھانے والے شخص نہ تھے۔ میں جب

امتحان قبول میں پاس ہو گیا تو اس سے ان کی زندگی کی تلخیوں میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ یہ امتحان اسکندریہ کے دینی ادارہ کی انتظامیہ نے لیا تھا۔ تقریباً دو سو طالب علم کامیاب ہوئے۔ جن کی دستاویزی ہوئی اور جنہیں مخصوص جُتہ لوڑھایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی عمر میں، میراجُتہ و دستارِ نسب تن کرنا بڑا مصحکہ خیز سالگتا ہو گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مجھے اس ”مسئلہ کردہ لباس“ پہننے سے عمر بھر کوفت سی محسوس ہوتی رہی۔

میں ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ میں ”شیخ محمد“ بن گیا۔ مجھے کھیل کود سے دلچسپی تھی۔ مگر ایک ”شیخ“ کیوں کر کھیلے؟ میں بہت فسوز تھا اس پر مجھے زبرد تو بخ یعنی دانٹ ڈپٹ کی جاتی۔

میں نے اپنی کتابوں کی دکان پر، جس پر ہماری گزرمسرت ہوتی تھی، توجہ دی۔ مجھے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اس لئے میرے والد نے مجھے پڑھائی کی مکمل چھٹی دے دی۔ اگرچہ والد کو یہ دیکھ کر ڈکھ بھی ہوتا تھا کہ میں مذہبی کتابیں پڑھنے کے بجائے غیر ملکی ناولوں کو ترجیح دیتا تھا۔ والد محترم میرے مطالعہ کے لئے جو کتابیں تجویز کرتے تھے میں انہیں تو نہ پڑھتا بلکہ ان کی جگہ الف لیلہ کا شوق سے مطالعہ کرتا۔

بڑا ہونے کے بعد، مجھے پتہ چلا کہ کئی مذہبی کتابیں وضعی اور بے سرو پا خریدیوں اور علمی خرافات سے بھری پڑی ہیں لیکن عوام ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے دقائق الاخبار فی ذکر الجنۃ والنار، الروض الفائق فی الوعد والوعظ، حنفیہ الغافلین، الخمرۃ الالہیۃ، الفتوحات المکیہ وغیرہ۔ اسلامی ثقافت اس وقت بلکہ اب بھی زہر آلود اور نشہ آور مواد سے اُٹی پڑی ہے۔ لہذا اس کی چھان بچک کی ضرورت ہے تاکہ نقصان دہ مواد کو الگ کیا جاسکے۔

میری عمر کا گیارہواں سال شروع ہوا تو میں ازہری تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہو گیا۔ یہ 1928ء کی بات ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی کا پہلا عشرہ، خمیر کثیر پر مشتمل تھا۔ میں نے انہی دس برسوں میں قرآن مجید حفظ کر لیا نیز اس تعلیم

کے حصول کے لئے تیار ہو گیا جس کے لوگ مشتاق ہوتے ہیں۔

اس مرحلے میں اصل کردار میرے والد کا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اللہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا سب مال و متاع میری تعلیم کے لیے فروخت کر ڈالا تاکہ میں دینی تعلیم حاصل کر کے اسلام کی خدمت کروں۔ ان دنوں ازہر دین اور زبان کا قلعہ تھا۔ جامع ازہر انگریزی قبضہ کے اس طرح خلاف تھا جس طرح اُسے فرانسیسی تسلط سے نفرت تھی۔ ازہر، کبادکار سام راج کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا جب کہ یہ حریت پسندوں اور مجاہدوں کا مورچہ اور کمین گاہ تھا۔

## دینی و دنیوی تعلیم

اب میں اسکندریہ کے دینی ادارے میں داخل ہو گیا تاکہ اس میں اپنی قیمتی عمر کے نو سال گزاروں۔ پڑھائی، جیسا کہ دستور تھا، پورا دن ہوتی تھی۔ صبح شروع ہوتی اور شام کو ختم ہوتی۔ پڑھائی بہت عمدہ تھی۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ خالص دینی تعلیم تھی۔ دنیوی تعلیم کا نصاب گراں قدر تھا۔ عام اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ سے ہمارا معیار تعلیم کسی لحاظ سے کم نہ تھا۔ البتہ ہم غیر ملکی زبانوں کی تعلیم سے یکسر محروم تھے۔ اگر ہمیں غیر ملکی زبانیں پڑھائی جاتیں تو ہم ان کے سیکھنے میں کامیاب ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہمارا نصاب تعلیم شیخ محمد مصطفیٰ الراغی کا تیار کردہ تھا۔ موصوف کا تعلق شیخ محمد عبدہ کے اصلاحی مسلک سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ زیادہ مدت تک اپنے منصب پر فائز نہ رہ سکے تھوڑے ہی عرصہ بعد، قصر شامی نے آگ بجولہ ہو کر آپ کو معزول کر دیا اور آپ کی جگہ شیخ احمد خواہری متعین کیے گئے۔

نئے شیخ الاذہر نے پوری باریک بینی کے ساتھ، اپنے پیش رو کے مقرر کردہ نصاب تعلیم کو لاگو کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دور ازہر کے درخشندہ ترین ادوار میں سے ایک محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ



ہے۔ اس لیے کہ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، حساب، الجبرا، جیومیٹری کی پڑھائی، مقامی، اسلامی اور عالمی تاریخ نیز پوری دنیا کے جغرافیہ کا مطالعہ و تعلیم، یہ سب اسباق طالب علم کی سوچ کو روشن کرتے ہیں۔ درست فیصلہ کرنے میں اس کے مدد و معاون بنتے ہیں بلکہ ان علوم کے مطالعہ کے ذریعے ہی شرعی حقائق صحیح تناظر میں سمجھ آسکتے ہیں۔

میں مذہبی تعلیم و تدریس میں مشغول کچھ حضرات کو جانتا ہوں جنہوں نے کچھ متن اور پرانی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ اسلام کا نام لے کر، فضا کو مسخر کرنے اور چاند پر اترنے کو جھٹلاتے ہیں۔ زمین کے گول ہونے اور اس کی گردش کا انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس پر اترتے اور فخر کرتے ہیں۔ یہ ہے ان بے چاروں کا مبلغ علم۔

ہمارے ادارے میں پڑھائی نصف داخلی تھی۔ لمبی چوڑی خواب گاہیں بنائی گئی تھیں۔ ہر طالب علم کو بہ طور وظیفہ ماہ وار 30 قرش ملتے تھے تاکہ وہ اپنے کھانے وغیرہ پر خرچ کر سکے۔ اس وظیفے نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ خاص طور پر جب میرے والد کے اقتصادی حالات خراب ہو گئے اور وہ مفلس و تلاش ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ چار سال کے بعد حالات ایسے بگڑے کہ والد واپس اپنے گاؤں جانے پر مجبور ہو گئے جہاں سے وہ آئے تھے۔ اُن دنوں 30 قرش کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ ایک قرش کے دس انڈے ملتے تھے۔ وہ ہمارے موجودہ دور کے ڈیڑھ سو قرش کے برابر تھے۔

یہ سب اخراجات، مسلمانوں کے لوقاف میں سے پورے کئے جاتے۔ استعمار نے مسلم ممالک پر قبضہ کرنے کے بعد لوقاف خیر کیوں بند کیا؟ اس کا راز مجھ پر منکشف ہو چکا ہے۔ مگر میں یہاں پر اس بات کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اور دینی ادارے میں اپنی زندگی کا تذکرہ کرتا ہوں۔

میں عقوانِ شباب ہی سے پبلک کے معاملات و حالات میں گہری دل چسپی لیتا ہوں اور اصول حکمرانی کی بابت فکر مند رہتا ہوں۔ میں حریت و عزت کو عشق کی حد تک چاہتا

ہوں۔ میں اس بات پر سخت شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ میری طرف کوئی عیب منسوب کیا جائے۔ میں دوستوں سے پر خلوص دوستی رکھنے پر یقین رکھتا ہوں۔ دشمنوں سے عدولت میں پاکیزہ خاطر رہنا میرا شیوہ ہے۔ میں عزت و احترام کا آرزو مند رہتا ہوں اور اس کی ”قیمت“ بھی بہ طیب خاطر ادا کرتا ہوں۔

## سیاسی اضطراب۔ مظاہرے کی قیادت، گرفتاری اور رہائی

میں ابھی عنوانِ شباب ہی میں تھا کہ اسماعیل صدیقی پاشا نے حکومتِ سنہالی۔ اس نے پہلا آئین کا لہدم قرار دید۔ نیا آئین پیش کیا۔ اس سے پہلے محمد محمود پاشا نے وقتی طور پر آئین معطل کر کے، ضربِ کاری کے لئے فضا ہموار کر دی تھی۔

قوم ان تصرفات کے خلاف تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ قصر شاہی اور اس کی پارٹیاں، انگلستان کے مفاد میں اور مصری عوام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ مصری طلبہ، سرکشی و نافرمانی کی تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ لہذا ہمارے ادارے کا اس جنگِ آزادی میں حصہ لینا قابلِ تعجب تھا اور نہ ہی میرا سرکردہ رہنماؤں میں شامل ہونا باعثِ حیرت تھا۔ مجھے اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ میں نے ایک پر تعہد مظاہرے کی قیادت کی۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ پھر دو گنتی کی رقم ادا کرنے پر مجھے ضمانت پر رہائی ملی۔ یہ رقم میرے والد بزرگوار نے ادا کی جو محنت و مشقت کی تھکاوٹ سے بھرا ہو چکا تھا۔ مظاہروں کی قیادت اور گرفتاری ایک معمول بن چکا تھا۔ عام معافی کا قانون منظور ہوا تو پھر مجھے جیل سے رہائی ملی۔ اگر عام معافی کا اعلان نہ ہوتا تو نہ جانے میرا کیا انجام ہوتا؟

میں نے اپنے تعلیمی ادارے کے اندر ایک مظاہرے کی قیادت کی۔ تفتیش کے بعد مجھے ایک سال کے لئے پڑھائی سے روک دیا گیا۔ بیابالفاظ صحیح، مجھ پر سال کے آخر میں منعقد ہونے والے امتحان میں بیٹھنے کی پابندی لگا دی گئی۔ میں ثانوی درجہ کے دوسرے سال میں

تھا۔ اپنے ہم سبق دوستوں سے ایک سال پیچھے رہ جانا مجھے گوارا نہ تھا۔ لہذا میں نے بالآخر باقاعدہ پڑھائی چھوڑ دی اور ادارہ سے الگ ہو گیا۔ میں نے اس موقع پر فیصلہ کیا کہ میں ”شہادتِ ثانویہ کی قسم اول“ کا امتحان بہ طور پر اپنی ویٹ امیدوار دوں گا۔ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا تھا جس کی بہت کم لوگ جرات کرتے ہیں۔

ادھر میرے والدِ محترم کا.... میرے مستقبل کے بارے میں ان کی امیدوں کی شکست اور میرے بارے میں اپنے خوابوں کے چمکتا چور ہونے کے دکھ سے..... بُرا حال تھا۔ وہ تو مرنے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

## نتائج

ایک زبردست بیماری نے مجھ پر اچانک دھاوا بول دیا اور میں پورے تین ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ میرے جسم پر بے شمار مسلک پھوڑے پھنسیاں نکل آئے تھے۔ میں ان تین مہینوں میں ایک دوسری ہی دنیا میں رہا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ میں اب مرنے والا ہوں۔ میرے گاؤں والے میری موت کی خبر کے منتظر رہتے تھے مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے؟ شفا کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے گھر کا سب سرمایہ، جمع پونجی میرے معالجہ پر لگ چکی ہے۔ میرے صابر و شاکر والد نے، میری صحت کی خاطر، علاج میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

اب میں کیا کرتا؟ اس بیماری سے اٹھا تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ میں نے اسکندریہ میں تعلیمی ادارہ کے اپنے ساتھیوں کو لکھا کہ وہ مجھے اپنی کاپیاں بھیج دیں جن میں انہوں نے ریاضی کے سوالات حل کر رکھے ہیں۔ نیز کچھ نصابی کتابیں روانہ کر دیں، خدا میرے دوستوں کو خوش رکھے۔ انہوں نے مدد کرنے میں دیر نہ کی اور مجھے مطلوبہ چیزیں فوراً بھیج دیں۔ مجھے تقریباً تیس مضامین کی تیاری کرنا تھی۔ یہ ثانویہ کے پہلے، دوسرے اور

تیسرے سالوں کے مقرر کردہ کورس تھے۔ پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دینے والوں کو ان سب مضامین کا امتحان دینا ہوتا تھا۔ ادھر میرے دوست فزکس اور کیمسٹری کے مضامین ماہر اساتذہ سے پڑھ رہے تھے وہ لیبارٹری میں جا کر تجربات کرتے، اساتذہ سے براہ راست الجبرا، حساب اور جیومیٹری سیکھتے ادھر میں اپنے مکان کی چھت پر کھٹی کے خشک چارے پر بیٹھ کر مصروف مطالعہ ہوتا۔ میں اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کرتا۔

ادارے میں میری تعلیمی حالت عام سی تھی۔ میں صرف ادب اور زبان کے مضامین میں سب سے نمایاں تھا۔ جہاں تک فقہ و تفسیر وغیرہ کا تعلق ہے تو مجھے نور الایضاح، قدوری، مجمع الانصار علی ملتقى الاحار جیسی کتابوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ یہ فقہ حنفی کی کتابیں ہیں۔ میں تفسیر نفیسی اور تفسیر ابی السعود سے بھی گھبراتا تھا۔

ادارہ سے اپنی علیحدگی کے ایک سال بعد، میں پہلی مرتبہ ادارہ گیا تاکہ بہ طور پرائیویٹ امیدوار امتحان دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت سخت مرحلہ تھا۔ میرے سابق ہم جماعت دوست، میری حالت پر افسردہ تھے۔ مگر وہ میرے پندارِ نفس کو بھی ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے تھے لہذا میرے ساتھ دلی شفقت تو رکھتے مگر منہ سے کچھ نہ بولتے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح پرسکون رہ کر امتحان دیا۔ اب میں نے مناسب نہ سمجھا کہ گھر جا کر نتیجے کا انتظار کروں لہذا میں نے نتیجے کے اعلان تک ادارے کے ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر نتیجہ نکل آیا۔ میں نہ صرف یہ کہ اس مشکل امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ پورے ملک میں اول آنے والوں میں شامل تھا۔ جب کہ اسکندریہ کے دینی ادارہ میں اول آیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ یہ میری مہارت و ذہانت یا محنت و کاوش کا ثمرہ نہیں بلکہ میرے مومن متوکل صابر والد محترم کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

## مرحلہ ثانویہ

ایک بار پھر میں نے ادارے کے اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سال چارم میں پڑھنا شروع کر دیا۔ پہلے اندیشہ تھا کہ میرے کچھ سال ضائع ہو جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ میں نے تنہائی میں اپنا محاسبہ کیا تو مجھے غلطی پر ہونے کا احساس نہ ہوا۔ میں حق بجانب تھا اس لئے کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔ میں نے شریفانہ جذبہ سے کام لیا تھا۔ میں استبداد کے خلاف نبرد آزما ہوا تھا۔ میں نیاپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے کبھی یہ سوچ پریشان کر دیتی کہ مجھے اور میرے خاندان والوں کو کتنی بڑی ناگمانی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر تقدیر مجھ پر مہربان نہ ہوتی اور مجھے بھروسے نکال نہ لیتی تو میں مکمل طور پر ڈوب ہی جاتا۔ جی ہاں! مجھ پر کئی ایسے لمحے آئے جب میں ہر چیز سے بے گانہ ہو گیا۔ مجھے مخلوق کی عاجزی و بے بسی کا عین الیقین ہو گیا۔ خدائے واحد و قہار کے سوا کسی نے میری دست گیری نہ کی۔

میرے والد کے معاشی بحران بڑھ گئے تو میں معمولی فیس کے عوض بچوں کو پڑھانے لگا۔ میں اس طرح چند قرش کماتا، ان کے سارے ادارے میں ٹھہرا ہوا حتیٰ کہ میں نے ثانویہ اخیرہ کی ڈگری حاصل کر لی۔ شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشید کے تیار کردہ اصلاحی نصاب کی یہ آخری ڈگری تھی یعنی ہماری جماعت اس نصاب کی ڈگریاں حاصل کرنے والی سب سے آخری جماعت تھی۔ ہمارے بعد یہ پورا نصاب ہی تبدیل کر دیا گیا۔ اس میں ریاضی، سائنسی اور نہایت مفید انسانی علوم کو یک بیینی ددو گوش نکال باہر کیا گیا۔

ہم آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ شیخ مراغی نے علمی جہاد کی تکلیفوں سے اکتا کر بالآخر قصر شاہی کے ساتھ تعاون کرنے والی پارٹیوں کا ساتھ دینے میں راحت کو ترجیح دی اور ازہر کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ دینی تعلیم میں آہستہ آہستہ انحطاط آنے لگا۔

میں نے 1928ء اور 1937ء کے درمیانی سالوں میں ادارے میں اپنی تعلیم سے بہت فائدہ اٹھایا۔ میں یہاں پر بر سیلنڈ کرہ تانا چلوں کہ ہمارے ادارے کی انتظامیہ نے ہمارے جسموں میں پھیلی ہوئی بیماریوں کا قلع قمع کرنے میں پوری تندی سے جہاد کیا۔ طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے تورتی لومیہ (Bilharziasis) کا مرض لاحق ہے۔ انتظامیہ نے پورے چار سال لگاتار میرا علاج کروایا۔ اس دوران مجھے تقریباً پچاس ٹیکے لگے تاکہ بیماری کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

## کچھ سوالات

ہم نے زبان و ادب کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ پرانی کتابوں پر اتنی زیادہ توجہ کیوں دی جاتی ہے۔ پرانے نحو لکھنے والے حضرات اپنے قواعد پر شعر، نثر اور قرآن کریم سے استدلال کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ پہلے مسئلہ میان ہوتا، اس کے بعد دلائل دیئے جاتے۔ یہ سب نحوی مسائل ثبوت تو ہو جاتے مگر زندگی کے تمام مراحل پر ان کی تطبیق کا مرحلہ باقی رہ جاتا۔ اگر اس قسم کی پرانی کتابیں ضرور پڑھانی ہیں تو پھر انہیں شخص کے مرحلے میں پڑھانا چاہیے۔ اس سے پہلے نحو اور بلاغت کی کتابیں اس طریقہ پر پڑھائی جائیں جو طریقہ ادیب و شاعر علی الجارم نے اپنی گراں قدر کتابوں میں اختیار کیا ہے۔ شاید مستقبل میں زبان کی تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے۔ شاید جان بوجھ کر عربی زبان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس سے بے اعتنائی دے تو جی بڑی جاتی ہے۔

طہارت خانوں سے متعلق فقہی مسائل سب لوگوں کو پڑھائے جاتے ہیں گویا کہ لوگ صحرائے جزیرہ میں رہ رہے ہیں۔ انسانی معاشرہ وسیع تبدیلی سے دوچار ہو چکا ہے لہذا فقہی احکام کی تدریس کے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا جائے، نہ صرف صفائی و طہارت کے معاملے میں بلکہ زندگی کے تمام دیگر معاملات میں بھی۔

ہم اپنے طالب علمی کے دور میں، نوجوانی کے زمانے میں اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے اور ان امور کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔

## امام حسن البنا سے ملاقات

اسکندریہ میں میری تعلیم کا آخری سال تھا کہ مجھے الاستاذ الامام حسن البنا سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔ میں راس العین کے محلہ میں واقع مسجد الرحمن بن ہرمز میں بیٹھا، قرآن شریف کی اپنی منزل پڑھ رہا تھا۔ مجھے نماز مغرب کا انتظار تھا کہ نماز پڑھ کر چلا جاؤں گا کہ مغرب کی نماز کے فوراً بعد ایک صاحب نے درس دینا شروع کیا۔ یہ درس جامع تھا۔ وضاحت، تاثر اور صداقت اس درس کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہ صاحب حسن البنا تھے۔ میں نے اسی دن فیصلہ کر لیا کہ میں ان کی پیروی کروں گا یعنی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی خاطر، زندگی کے سفر میں ان کے ساتھ قدم ملا کر چلوں گا۔

## اصول دین کالج میں داخلہ

جامع الازہر کے کلیات میں سے ایک کتبہ اصول الدین ہے۔ میں نے اس میں داخلہ لے لیا۔ 1938ء سے پڑھائی شروع ہوئی۔ اسکندریہ کے اداروں سے بھی کچھ ساتھی اس کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر زیرک و دانا، ہیدار مغرور عمدہ صلاحیتوں کے مالک تھے مگر اسکندریہ سے آنے والوں کی تعداد کم تھی۔ ہم جب اسکندریہ کے درے میں داخل ہوئے تھے تو ہماری تعداد دو سو تھی۔ ثانویہ عامۃ کا امتحان دیا تو ہم ستر رہ گئے۔ پھر ہم ازہر کے تین کالجوں میں مٹ گئے یعنی عربی کالج، شریعت اسلامیہ کالج اور اصول الدین کالج۔ کچھ لوگ دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔ ہمارے ہم جماعتوں کی ایک بڑی تعداد دیہات میں رہ گئی جو بوجہ اپنی پڑھائی مکمل نہ کر سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ازہری تعلیم کی تکمیل

نہ کر سکنے والے حضرات دیہات میں علماء کی طرح رہتے تھے وہ لوگوں کو فقہ، حدیث اور تفسیر کے علوم پڑھاتے تھے وہ لغت کو اس کے دین سے مربوط رکھتے تھے۔

عالمی سامراج، اس قوی دینی تعلیم اور روح اسلام کو باقی رکھنے میں اس کے اہم کردار سے غولی آگاہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ دینی نظامِ تعلیم کو ناپسند کرتا ہے اور اس کے خاتمہ کے لئے بدترین تدبیریں کرتا رہتا ہے۔ خیر میں نے پورے ملک کے شہروں سے فارغ التحصیل ہو کر آنے والے اپنے دوستوں کے ہم راہ علی زندگی کے اس نئے مرحلے کا آغاز کر دیا۔

## ایک عجیب واقعہ

کالج کے پرنسپل نے ہمیں مسجد خازن دارہ میں اکٹھا ہونے کے لئے کہا تاکہ باہمی تعارف بھی ہو اور نئے سال کا استقبال بھی۔ طلبہ اور اساتذہ میں تعلقات مضبوط ہوں۔ اس تقریب میں ایک اہم واقعہ رونما ہو گیا۔ جن حضرات نے اس تقریب سے خطاب کیا ان میں سے ایک کالج میں فلسفہ و اخلاق کے استاد، پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ تھے۔ دورانِ خطبہ آپ نے فرانسیسی معاشرے کی خوب تعریف کی۔ اس کی لمانت داری اور نظم و ضبط کی بڑھ چڑھ کر مدح سرائی کی۔ انہوں نے ہمیں بھی ان صفات کو اپنانے کی تلقین کی۔

مجھے یہ سن کر سخت طیش آگیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا سہ کو از بلند کہا۔ ”کون سی صفات یا استاذ! یہ لوگ تو بچے چور ہیں۔ انہوں نے چوری کرنے میں بہت ترقی کی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں چور وہ ہوتا ہے جو گھر سے کوئی بدتن چرائیتا ہے یا کسی کی جیب سے ہوا نکال لیتا ہے یا کسی کے باغ سے پھل توڑ لیتا ہے۔ مگر یہ فرانسیسی اور اہل مغرب تو دن دیساڑے قوموں کی چوری کرتے ہیں۔ یہ قوموں کو لوٹتے ہیں۔ یہ دلوں سے نظریات اچک لیتے ہیں۔ عالم اسلام کے مغرب میں واقع ممالک پر، ہمارے بھائیوں پر، قبضہ کر لینے والے ان ڈاکوؤں سے ہمیں



کون سی صفات سیکھنے کی استاذ محترم آپ تلقین فرما رہے ہیں؟ آپ ہمیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم اپنے عظیم اسلاف کے نقش قدم پر چلیں۔ ان کے اخلاق و اطوار اپنائیں۔“

میں کچھ اس قسم کی باتیں کہتا چلا گیا جس سے محفل کا نظم و ضبط برقرار نہ رہ سکا۔ انتظامیہ کے افراد نے مجھے پکڑ لیا اور کالج کے پرنسپل شیخ عبد المجید اللہ خان کے دفتر لے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بیس سال کا ایک نوجوان جوش و جذبہ سے مغلوب الحال ہو چکا ہے تو انہوں نے مجھے بڑے پیار سے کہا۔ بیٹھ جاؤ بیٹا۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ پرنسپل صاحب نے کسی اور استاذ کو طلبہ سے خطاب کرنے کے لئے کہا۔ طلبہ میرے ہم نوا بن چکے تھے بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر اساتذہ نے بھی ڈاکٹر محمد یوسف کے نقطہ نظر کو پسند نہیں کیا بلکہ میرے موقف کی تائید کی۔ پرنسپل صاحب نے مجھے ہر گز سرزنش نہ کی بلکہ چند نصیحتیں کیں۔ محفل ختم ہوئی تو مجھے دفتر سے جانے کی اجازت ملی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ کے ساتھ میرے تعلقات مضبوط ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ مجھے ہمیشہ ترجیح دیتے۔ کالج میں تعلیم کی پوری مدت کے دوران میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ کالج سے فارغ ہو کر نکلا تو ہم دونوں میں گہری دوستی نے جنم لیا۔ دعوتِ اسلامیہ کی خدمت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے رہے۔

## یورپ میں اسلام کی تعلیم

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بہت سے علماء نے یورپی یونیورسٹیوں سے امتیاز کے ساتھ ڈاکٹریٹ کیا اور واپس اپنے ملک آکر پوری قوت کے ساتھ اپنے دین کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ یورپ میں رہ کر تعلیم حاصل کر کے انہوں نے جو کچھ سیکھا، اسے علمی جدوجہد کے میدان میں بہ روئے کار لا کر ازہر یوں کے موقف کو عمدہ طریقہ پر پیش کرنے

میں استعمال کیا۔

کچھ ایسے علماء بھی یورپ سے ڈگری لے کر آئے جو اسلام کی خاطر شس سے مس نہیں ہوئے۔ انہوں نے وہاں سے نحو، فقہ اور تاریخ کے مضامین میں ڈاکٹریٹ کی اسناد ضرور حاصل کر لیں مگر اپنے ملک میں حاصل کردہ تعلیم کو یورپ میں چھوڑ آئے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مقالے دراصل ان کی ناکامیوں کی دستاویزات ہیں۔ یہاں اگر انہوں نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کی۔ میں نے ایسے ہی ایک ”ڈاکٹر صاحب“ سے اس کی خلافِ اسلام تحریر پر عصف کی تودہ حیران ہو اور بھونچکا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب ڈاکٹریٹ حماقت سے کر بیٹھے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس قماش کے کچھ لوگ ازہر کے منصبِ قیادت پر اجماع رہ چکے ہیں۔

## قدیم ازہری تعلیم

آئیے ہم واپس کالج چلتے ہیں، جس میں، میں نے داخلہ لیا تھا۔ نصاب ہائے تعلیم کے عمدہ اور جامع ہونے میں کلام نہیں اگر باصلاحیت استاد میسر ہو تو اعلیٰ درجہ کے داعی اور مدرس تیار ہو سکتے ہیں۔ جس طریقہ تعلیم کے مطابق ہمیں پڑھایا جاتا تھا اس سے ذہنوں میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔ مطلوب و مراد کے حصول میں آسانی رہتی اور مفادِ ہم کو بہ طریقِ احسن ضبط کرنے میں مدد ملتی۔

تینوں فقہی مذاہب، تقریباً یکساں نسبت سے طلبہ و مدرسین میں پائے جاتے تھے مگر کمال یہ ہے کہ اس سے فرقہ بندی، گروہی عصبیت یا تقسیم در تقسیم کی نحوست و مصیبت جنم نہیں لیتی تھی بلکہ بعض اوقات تو خوش طبعی اور دل لگی سے علمی بحث و تحقیق کو جلا ملتی تھی۔ سلف و خلف کے افکار و آراء کو پورے ادب و احترام کے ساتھ پیش کیا جاتا اور یہ کام غیر جانب داری اور کشادہ دلی سے سرانجام پاتا۔ کالج کے نصاب ہائے تعلیم میں تقلیدی علوم کے محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ساتھ ساتھ، مختلف ادوار میں فلسفہ کا وسیع مطالعہ نیز نفسیات اور اخلاق کے علوم کا بھی وسیع مطالعہ شامل تھا۔

میری رائے میں علماء اسلام کو ان تمام علوم میں تبحر ہونا چاہیے، ان میں متناقص و متضاد آراء کے فہم اور ان کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی بھرپور نفسیاتی قدرت و صلاحیت ہونی چاہیے۔ ایک عالم دین جس ذہنی صلاحیت و استعداد کے ساتھ تصوف اور دین کے حقائق کو سمجھتا ہے اسی طرح اس میں کیونہ نہ سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

فکری کشادگی کے ساتھ وسیع النظر فی حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کو بلا کم و کاست اور درست تناظر میں سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں وسیع النظر فی پیدا ہوتی ہے۔ وہ صرف اسی وقت مشغول ہوتا ہے جب کبھی کسی اہم اصول و بیاد پر زد پڑ رہی ہو۔

اس حقیقت کو نظر انداز کرنے سے ہی ہمارے علمی تاریخ میں کئی شکاف اور دراڑ پڑے۔ میں نے لکھنؤ تحریک کے خلاف صادر ہونے والے شاہی فرامین دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ دو وجہوں سے انہیں قید خانہ میں ڈالا گیا۔ اول یہ کہ انہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ ایک لفظ سے تین طلاق دینے سے ایک طلاق پڑتی ہے۔ دوم یہ کہ انہوں نے تبرک کے لئے رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کی زیارت کو مکروہ قرار دیا تھا۔ نہ پہلی بات پر انہیں قید خانہ میں ڈالنا مناسب تھا اور نہ دوسری وجہ سے۔ اس لئے کہ یہاں خطا و مصلحت اور درست و غلط رائے کا تعلق فرعی امور سے ہے۔ قید خانہ میں ڈال دینا اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

## اساتذہ سے ہمارا رابطہ

ہمارے کالج میں متعدد دراکم علماء فریضہ تدریس سرانجام دیتے تھے۔ جیسے شیخ محمد ابو زہرہ، ڈاکٹر محمد احمد غمراوی، شیخ امین الخونی، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، استاد عبدالوہاب

خلاف، شیخ محمد خضر حسین، ڈاکٹر محمد البیسی، ڈاکٹر محمد عبداللہ ماضی، علامہ ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ اور غیور مجاہد مولانا محمد الاودن اور دیگر حضرات۔ اتنے قابل و فاضل اساتذہ کے ہوتے ہوئے بھی ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارا مستقبل غیر یقینی ہے۔ فارغ التحصیل ہونے والے اپنے انجام کو سڑکوں کے حوالے کریں گے۔ جو لوگ ہمیں پڑھاتے ہیں انہیں ہمارے مستقبل کی کوئی پروا نہیں۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ازھر پر سخت ابتلاء کا دور آیا ہوا ہے۔

بڑے بڑے درخشاں ناموں والے حضرات روپوش ہو گئے تھے باقی علماء اپنے مقررہ لیکچر دینے آتے اور لیکچر دینے کے فوراً بعد اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے ایسے بزرگ نہیں ہیں جو ہم پر شفقت کرتے ہوں، ہمارے معاملات و مسائل میں دل چسپی لیتے ہوں۔ اگر خود ہم نے ہی اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے کچھ نہ کیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔

ہمارے شیوخ کے انتظامی لحاظ سے عہدے اگرچہ مختلف تھے مگر سبھی بات یہ ہے کہ ہم اپنے اساتذہ کے رویہ کے شاکی تھے۔ کھلیہ الآداب کے ڈاکٹر طاہر حسین اپنے طلبہ کو ٹی پارٹی میں بلاتے، ان کے ساتھ گپ لگاتے حتیٰ کہ وہ فارغ التحصیل طلب علموں کے ساتھ بھی رابطہ رکھتے۔ انہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ یا کس منصب پر فائز ہو چکا ہے؟ اُدھر یہ حال تھا اُدھر ہمارے اصول الدین کالج میں اساتذہ اور طلبہ کا تعلق رسمی بلکہ واجبی سا ہوتا۔

اس کشیدگی اور بے رخی و بے اعتنائی کی جڑیں پرانی تھیں۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً تعجب ہو گا کہ طلبہ نے ایک بار انتہائی غیض و غضب اور برہمی کی حالت میں شیخ الجامع الا ازھر شیخ احمد خواہری کے دفتر پر ہلہ بول دیا اور ڈنڈوں سے دفتر کی چیزوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر خدا نخواستہ اس وقت شیخ خود دفتر میں موجود ہوتے تو طلبہ مار مار کر ان کا کچھ مر نکال دیتے۔ ان کے بعد شیخ مراغی نے یہ منصب سنبھالا تو ان کی ذات سے لمبی چوڑی امیدیں وابستہ

کی گئیں مگر جلد ہی یہ امیدیں مایوسی میں بدل گئیں وہ اپنے پیش رو سے بہتر ثابت نہ ہو سکے۔ وہ علماء دین جو صرف تقریر کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں وہ اس فرض کو کسی نہ کسی طرح ادا کر کے پھر اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں نہ وہ حق کی حمایت کرتے ہیں اور نہ انہیں نسل نو کی تربیت سے کچھ سروکار ہوتا ہے۔

میں نے کچھ نام نہاد علماء کو دیکھا ہے کہ وہ خرافات و بدعات ہوتے اور ان کے پھلنے پھولنے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اعزاز و اکرام حاصل کرنا اور لوگوں کا منظور نظر بننا ہوتا ہے۔ مگر جن علماء کے پاس دین کی صحیح سمجھ ہے وہ اسے شنگ مزاجی اور عوام سے بے رخی اختیار کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔

## اخوان المسلمون کا ظہور

خیر ہم سبق پڑھتے اور امتحانات دیتے رہے۔ مصر کے سیاسی حالات ان دنوں تہوج کا شکار تھے۔ قصر شاہی اور اس کی حامی جماعتیں اگر ایک طرف تھیں تو مصری الوفد پارٹی..... جو عوام کی اکثریت کی حقیقی نمائندگی کر رہی تھی... دوسری طرف تھی۔ دونوں کے مابین شدید کش مکش جاری تھی۔ اسی دوران ایک اور تحریک نے جنم لیا۔ حکمرانوں نے ابتداء میں اس تحریک کو دور خور اعتنا نہ سمجھا۔ یہ اخوان المسلمون کی تحریک تھی۔ اس کا آغاز معمولی طور پر ہوا۔ نہ کوئی گڑبڑ ہوئی نہ کوئی ہنگامہ، نہ کسی کو ڈر یا دھمکا یا گیا۔ مگر چند ہی سالوں کے اندر اندر تحریک میں سو فیصد اضافہ ہو گیا۔ اس کے کئی سبب تھے۔

(اول)۔ مصری قوم کا دینی مزاج اور اسلام سے مثالی وابستگی و وارثی، جس کے تقویٰ و خلوص پر انہیں اعتماد ہو۔ اس کے حوالے اپنا سب کچھ کر دینے کا جذبہ۔

(دوم)۔ حسن البنائے ٹانفہ روزگار شخصیت آپ کو شرح و بیان اور نظم و نسق کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھیں کہ انتہائی ناموافق اور مشکل ترین حالات

میں بھی آپ اپنے مقصود و مطلوب تک پہنچ کر رہتے تھے۔

(سوم)۔ اخوان المسلمون کی مقبولیت میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ ”ثقافتی یلغار“ نے اپنے عزائم کو بے نقاب کر دیا تھا۔ عوام کو اس امر کا یقین ہو چلا تھا کہ اگر وہ اس یلغار کے سامنے بے حس و حرکت، سر تسلیم خم کیے پڑے رہے تو وہ دین و دنیا کی بازی ہار جائیں گے۔ اس سے بڑھ کر اب اور کیا ہوتا تھا کہ قاہرہ کے کلیۃ الآداب میں، قرآن کریم پر تنقید ہوئی، لوہیر ہاؤس میں ایک ڈرامہ پیش کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کی گئی۔ ہمارے کالج کا ان حالات سے دور رہنا اور متاثر نہ ہونا محال تھا۔ ہمارے کالج میں جماعت اخوان المسلمون کی شاخ قائم کرنا مشکل ٹھٹھ نہ ہو۔ یہ قویٰ یقین، پاکیزہ کردار، اسلامی کی فتح اور اس کے پرچم کو بلند کرنے کا عزم صمیم رکھنے والے عناصر پر مشتمل تھی۔ کالج کی جماعت اخوان المسلمون میں شامل ہونے والوں میں میرا تیسرا نمبر تھا۔ میں تقریباً ہر روز المرکز العام جاتا جو پہلے ”الجمعية الخضراء“ میں تھا پھر ”المجلس الجدیدة“ میں منتقل ہو گیا تھا۔ محترم مرشد عام، کالج کی ہماری سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھے۔ ہم سب دعوتی و تبلیغی کاموں میں پورے ذوق و شوق سے حصہ لیتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیۃ اصول الدین میں، میرے کئی رفقاء، آگے چل کر، میدان دعوت میں نمایاں ہوئے۔۔۔ وہ میدان خطابت اور عوام پر اثر انداز ہونے میں مجھ سے زیادہ کامیاب ہوئے۔

المرکز العام نے، ان پاکیزہ خصلت نوجوانوں کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں مختلف صوبوں اور علاقوں میں بھیجا جاتا، مختلف محلوں اور مسجدوں میں ان کے لئے میدان مہیا کیے جاتے۔ غرض کہ ان کی صلاحیتوں کو بہ طریق احسن استعمال کیا گیا۔

## مرشد کا گرامی نامہ

اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد مسلسل عمل سے ہماری صلاحیتیں

نکھر نے لگیں۔ میں اسی کالج میں زیرِ تعلیم تھا کہ الاستاذ المرشد کی جانب سے مجھ پر ایک خصوصی کرم ہوا۔ ایک دلچسپ بات ہوئی جس کا میری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ میں نے ایک روز ایک مضمون لکھا اور چھپنے کے لئے ”جملہ الاخوان“ کو بھیج دیا۔ میں اس کے چھپنے کا بے تابی سے انتظار کرتا رہا مگر یہ نہ چھپا۔ میں مایوس ہو کر یہ سوچنے لگا کہ مجھ میں اچھا لکھنے کی صلاحیت ہی نہیں چنانچہ میں نے مضمون لکھنا چھوڑ دیا۔

ایک روز ڈاک آئی تو اس میں المرشد العام کا خط تھا۔ بعد میں مجھے اس کا پس منظر معلوم ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک روز مرشد عام جملہ کے دفتر تشریف لے گئے تو پروفیسر صالح عثمانی ایڈیٹر المجلہ سے فرمایا۔ ”کیا بات ہے؟“ اخوان کے عمدہ مضامین پڑھنے کو نہیں ملتے؟ ۹ سالہ کیوں سطلی ہو گیا ہے؟“ یہ کہ کر مرشد عام نے، غیر ارادی طور پر، ”نا قابلِ اشاعت مضامین“ سے پھولی ہوئی ایک موٹی فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا، فائل کھولی تو اچانک ان کی نظر، میرے مضمون پر پڑ گئی۔ مضمون کو نظر انداز کرنے پر آپ بے فروخت ہوئے اور حکم دیا کہ اسے آئندہ شمارے میں ”افتتاحیہ“ کے طور پر چھپا جائے۔ پھر آپ نے ذاتی طور پر مجھے یہ خط لکھا۔

برادر عزیز شیخ محمد الغزالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں نے آپ کا مضمون ”الاخوان المسلمون والاخزاب“ پڑھا۔ میں اس کی فصیح عبارت، دقیق معانی اور اعلیٰ ادبیت پر مجموعۃً اخوان المسلمون! آپ سب کو ایسے ہی لکھنا چاہیے۔ ہمیشہ لکھتے رہیے۔ روح القدس آپ کی تائید کرے اور اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

آپ کا بھائی

حسن البنا

مرشد عام برائے اخوان المسلمون

اس خط کے بعد میں نے لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی میرا شمار جماعت کے صفتِ اول کے لکھاریوں میں ہونے لگا۔ مجھے اس امر کا یقین ہو گیا کہ جو کچھ میں لکھوں گا۔ تائید ایزدی میرے شامل حال ہوگی۔

## ماحول کا منفرد مزاج

میں ایک دن اپنے استاد محترم محمد عرفہ... رحمہ اللہ... سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ ”جماعۃ کبار العلماء“ کے رکن تھے۔ آپ نے بڑے پتے کی بات کہی۔ مجھ سے فرمانے لگے۔ کچھ ماحول حوصلہ شکن، ہمت شکن اور رسوا کن ہوتے ہیں اس کے برعکس کچھ ماحول حوصلہ افزا، ہمت بڑھانے والے اور عزت افزا ہوتے ہیں۔ امام شافعیؒ کے اس قول پر ذرا غور کرو کہ

”اللیث افقه من مالک ولكن قومه لم ينهضوا به“

لیث، مالک سے زیادہ فہم ہے مگر ان کی قوم نے ان کا ساتھ نہ دیا... اہل مدینہ نے مالک کی تعظیم کی اور انہیں مقام بلند پر پہنچا کر دم لیا مگر مصریوں نے لیث کو نظر انداز کیا تو لیث بھلا دیئے گئے.... پھر فرمایا.... از ہری ماحول دوسری قسم کا ہے۔ یہ اپنے میں سے کسی کی تائید و حمایت نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کوئی خارجی قوت انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔

گردش روزگار اور زندگی میں مختلف حالات و واقعات کا سامنا کرنے کے بعد، میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شیخ محمد عرفہ کی بات درست تھی۔ بالعموم اور زیادہ تر ایسے ہی ہوتا ہے۔ تاہم ہر معاشرے میں کچھ ایسے حضرات ضرور ہوتے ہیں جو انصاف کا دامن نہیں چھوڑتے اور ظلم و زیادتی کے قریب نہیں پھٹکتے۔ ومن قوم موسیٰ امة یهدون بالحق و بہ یعدلون (الاعراف۔ ۱۵۹)



موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔

## نا منظور مطالبہ

کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے دو سال بعد، میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میں یہ واقعہ اس لیے یہاں درج کر رہا ہوں کہ لوگوں کے طرز عمل، انصاف اور بے جا طرف داری کا کچھ موازنہ کیا جاسکے۔

پچاس کے عشرے میں ”مؤتمر الاسلامی“ قائم تھی۔ اس کے جنرل سیکرے ٹری ایف ٹی نٹ کرمل انور السادات تھے۔ مؤتمر نے مسلم مفکرین اور مصنفین کو دعوت دی کہ وہ اسلامی مشن کے فروغ کے لئے کام کرنے کی خاطر یک جا ہوں۔ مدعو حضرات کا ابتدائی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے بھی شرکت کی۔ استاد محترم نے وہاں مجھے دیکھا مگر نہ پایا۔ اس وقت تک، دعوت دار شاد اور اس کے دفاع میں، میری دس سے زائد کتابیں چھپ چکی تھیں۔ اس اجتماع میں علماء ازہر اور عظیم ادباء کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اجلاس شروع ہونے والا تھا کہ ڈاکٹر موسیٰ نے مؤتمر کے سیکرے ٹری سادات سے بہ آواز بلند کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہمارے ساتھ ایک اور صاحب بھی ہونے چاہئیں جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ یعنی شیخ محمد الغزالی۔“ ڈاکٹر موسیٰ صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ۔ ”جو نہی میں نے بات ختم کی۔ مجلس کو گویا سانپ سو نگھ گیا۔ ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ مجھے اس پر تشویش ہوئی۔ مجھے بات کرنے کا حوصلہ اس لیے ہوا تھا کہ وہاں ازہریوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جھٹ میری تائید کریں گے۔ مگر وہ سب خاموش، دم سادھے بیٹھے رہے۔ صرف ایک گواز نے مجھے شرمندگی اور خجالت سے چھایا۔ یہ گواز تھی استاد عباس محمود العقاد کی۔ وہ میری

تائید میں اپنی گلوگرفتہ آواز میں کہنے لگے۔ ”جی ہاں۔ میں نے اس نوجوان کو پڑھا ہے۔ اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔“ اس کے بعد تمام علماء شیخ غزالی کی تعریف کرنے لگے اور ان کو شامل کرنے پر اصرار کرنے لگے۔“

خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ مجھے بلایا گیا نہ میں گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ میرے خیال میں استاد اہلحد نے اپنی کتاب ”حقائق الاسلام ولباطیل خصوصاً“ موقوفہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔

میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے اور اہلحد کے مابین کوئی تعلق و رابطہ نہ تھا۔ میں فاضل مصنف سے نہ کبھی ملا تھا نہ کوئی ان سے راہ و رسم تھی۔ البتہ میں ان کے علم و ادب کا قدردان ضرور تھا۔

## اخوان المسلمون کا مثبت کردار

محترم حسن البنا کی حوصلہ افزائی اور اخوان کی توجہ و محبت، تصنیف و تالیف پر میرے جیسے رہنے کا سبب بنی۔ حالانکہ حکام کی طرف سے مجھے ہر اسباب کرنے کا عمل جاری تھا۔ طالب علمی کے دوران میں حصول تعلیم میں بھی مگن رہا نیز دارالحکومت اور صوبوں میں فروغ و دعوت کا کام بھی کرتا رہا۔

بلاشبہ مصر اور دیگر ممالک میں دینی خطرات میں جو خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے، اس کا بنیادی سبب اخوان ہیں۔ منبر و محراب سے سنائی دینے والے بے جان الفاظ نے اب زندگی و قوت کا روپ دھار لیا۔ تاریخ اسلام اور سیرت نبی ﷺ کو حرز جان بنایا جانے لگا۔ اسلاف کی سیرت کو از سر نو اٹھانے اور اپنی درخشندہ روایات پر عمل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا۔ وضعی قوانین اور غیر ملکی اور غیر اسلامی رسومات پر کھلم کھلا تنقید ہونے لگی۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات کو اٹھانے کے مطالبے نے زور پکڑا۔

ان حالات میں عملی دستے تشکیل دیئے گئے بعد میں جن کا نام ”نظام خاص“ رکھا گیا۔ اس ”نظام خاص“ کی تشکیل کا بنیادی سبب فلسطین کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا تھا۔ کیونکہ فلسطین میں یہودی جتنے کساد انگیزی میں مصروف تھے۔ نظام خاص کی بنیاد یہ جذبہ بھی بنا کہ اگر انگریزہ طبیب خاطر، مصر سے نہیں نکلتے تو انہیں بہ زورِ شمشیر یہاں سے نکال باہر کیا جائے۔

## میری کچھ عادتیں

عسکری تربیت کے لئے نام زد امیدواروں کی بہت بڑی تعداد میں، میرا نام بھی درج تھا۔ جب یہ فہرستیں الاسٹاد المرشد کو پیش کی گئیں تو آپ مجھے بھرتی کیے جانے پر رضامند نہ ہوئے۔ ایک ذمے دار شخص نے جب میرے بارے میں کہا کہ یہ مخلص آدمی ہے تو مرشد نے اُن سے کہا ”مجھے آپ سے پہلے معلوم ہے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن یہ عسکری نظام ہے جو مکمل اطاعت و فرماں برداری کا تقاضا کرتا ہے۔ جب کہ شیخ غزالی اپنی عادت کے مطابق ان حکموں پر اعتراض کریں گے جنہیں وہ منقول نہیں سمجھیں گے۔ وہ کہیں گے۔ کیا وجہ ہے؟ دلیل و ثبوت کیا ہے؟ پھر وہ رازداری میں بھی بہتر نہیں ہیں۔ جب وہ ناراض ہوتے ہیں تو ان کے چہرے پر غصہ کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ عسکری نظام کی بنیاد ہی مکمل رازداری ہے۔ انہیں رہنے دو۔ وہ لکھیں، تقریر کریں اور دعوتِ اسلامی کا کام کریں۔ یہ میدان ان کے لئے مناسب ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کام کے لئے مناسب نہیں ہے۔“

جب یہ مکالمہ مجھ تک پہنچا تو مجھے غصہ آیا۔ میں کافی عرصہ تک شکستہ خاطر رہا اگرچہ میں معمول کے مطابق اپنا کام و فاداری کے ساتھ سرانجام دیتا رہا۔

ایک دن میرے پاس استاد محمد فرید عبدالحق آئے۔ یہ المرکز العام کے پختہ کار افراد

میں سے ایک تھے۔ آپ مجھے ملنے میرے گھر تشریف لائے۔ دیوار پر کویزیاں ایک تصویر کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھایہ کیا ہے؟ پھر سادہ سے فریم کو اٹھار لیا۔ اس میں فوجی ٹریننگ کی وردی میں میری تصویر تھی۔ خالی جگہ پر مرشد عام کا وہ گرامی نامہ تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں جس خط میں مرشد عام نے میری تعریف کی تھی اور میرے لئے دعائے خیر کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہ ایک یادگار ہے جس پر مجھے فخر ہے۔“ کہنے لگے ”تمہیں مرشد سے اس حد تک محبت ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ کچھ لوگ جماعت اور اس کے قائد سے میری ہم وردی اور خلوص میں شک کرتے تھے کیونکہ میں مختلف مواقع پر اور اجلاسوں میں ان تمام باتوں پر اعتراض کرتا تھا یا انکار کرتا تھا جن کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ تاہم حسن البنا ایسے بچے نہ تھے کہ وہ نفخ رکھنے والوں کے تبصروں سے متاثر ہو جاتے وہ ایک عظیم اور ذہین انسان تھے۔ اس انکشاف کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ میں کچھ کتے یا تنقید کرتے ہوئے اپنا محاسبہ کرنے لگا، لوگوں کی دھوکہ بازی اور افترا پر دازی سے محتاط رہنے لگا۔

مگر کیا اس سے میرے مزاج اور افتاد و طبع میں واقعی کچھ تبدیلی رونما ہوئی۔ میرے خیال میں کچھ زیادہ نہیں۔ میں نے اس شخص کی پیروی کی تھی، جس کے بارے میں، میں نے سمجھا کہ وہ راہ حق پر ہے۔ حسن البنا کوئی پیشہ ور سیاست دان نہ تھے، وہ محاکم تھے نہ حیلہ ساز۔ وہ تو ربانی تھے جن کا دل یاد الہی سے مملو تھا۔ وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے والے اور خشوع و خضوع سے نمازیں لو اکرنے والے تھے۔ تلاوت کرتے وقت خوب روتے تھے۔ ان کی تقریریں سن کر سامعین کو روحانی بلندی نصیب ہوتی تھی، دنیا داری سے ان کا دل اچاٹ ہو جاتا تھا، سامعین میں، اللہ کے لئے کام کرنے کی محبت اور اس کے دین کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

اصول الدین کالج کے ہمارے اساتذہ میں ان اعلیٰ جذبات کی کمی تھی۔ وہاں صرف

روکھی پھینکی نظری پڑھائی ہوتی۔ زبانوں سے اس کی ادائیگی تو ہوتی مگر دلوں میں حرکت پیدا ہوتی نہ وہ غم ہوتے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ علمی پہلو سے بھی تدریس میں کئی مفید اضافوں کی ضرورت ہے۔ غیر مفید قدیم مضامین میں قطع و مرید اور اختصار ہونا چاہیے۔ بلکہ زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مضامین کو ایک داخلی نظام میں اس طرح از سر نو ڈھالا جائے کہ ان کا اثر طلبہ کی تمام سرگرمیوں پر پڑے۔

نہ جانے کیسے میں نے 1941ء میں شہادت العالیہ کی ڈگری حاصل کر لی۔ اگر اللہ کی توفیق و اعانت میرے شامل حال نہ ہوتی تو ایسا ہونا مشکل تھا۔

کامیاب ہونے والوں میں مدرسہ فہرست نہ تھا بلکہ میں تو پہلے دس کامیاب امیدواروں میں بھی شامل نہ تھا۔ تو کیا مجھے اس سے صدمہ پہنچا بالکل نہیں۔ اس لیے کہ میں کسی کو تابی یا کند ذہنی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ یہ تو میرے حالات تھے جنہوں نے مجھے پیچھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ میں کالج میں چار سال پڑھتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے پاس اپنی کوئی ایک کتاب بھی تھی۔ میں کتاب خریدتا کہاں سے؟ ہمیں صحیح مسلم کی شرح النووی صرف آدھی گنتی میں مل رہی تھی۔ اس رقم کو دس مہینوں میں قسط وار ادا کرنا تھا مگر میں نے انکار میں سر ہلایا۔ میں نے سوچا۔ میرے پاس جو رقم ہے وہ تو لباس خریدنے اور کھانے کے کام ہی آسکے گی۔ یہ کتاب خریدنے کے لئے رقم کہاں سے لاؤں۔ میں نے یہ بات دل میں سوچی مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔

## عذر مقبول یا مجبوری

اپنی مفلسی کی وجہ سے میں اساتذہ کی شروح کو غور و فکر سے پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اپنے والد کی دکان سے وہ کاغذ لے آیا تھا جن میں سودا سلف لپیٹا جاتا ہے۔ میں انہیں کاغذوں پر ضرورت کی چیزیں لکھتا تھا۔ میں کبھی ان ساتھیوں کے پاس بیٹھ جاتا جن کی اپنی

کتابیں ہوتی تھیں تاکہ میں ان کی کتابوں سے دیکھ کر کچھ نوٹ کر لوں یا کسی بھولے ہوئے مسئلے کو یاد کر لوں۔ میں کتنے ہی مسئلے اور حقائق بھول جاتا تھا۔

میری یہ مجبوری، آگے چل کر میری عادتِ جملہ عادتِ ثانیہ بن گئی۔ میں باہیا افراد کی طرح، اپنی یادداشت پر بہت زیادہ انحصار کرتا تھا۔ میں کاغذ کے استعمال میں بھی کفایت شعاری سے کام لینے لگا۔ میرے یہاں مسودہ و میٹھہ کچھ نہ ہوتا۔ بس لکھا ہوا کاغذ ہوتا جسے بعد میں طباعت کے لیے پریس میں بھیج دیا جاتا۔ اس کاغذ میں خالی جگہ نہ ہوتی۔ یہ شروع سے آخر تک استعمال ہوتا۔ حتیٰ کہ بعد میں (جب اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور فراخی نصیب ہوئی) بھی میری یہ عادتِ قرار رہی۔

## قبولیت دعا، کرشمہ قدرت

میرے ساتھ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش کیا جسے میں یہاں .... عبرت حاصل کرنے کے لیے .... درج کرتا ہوں۔

میں کالج میں زیرِ تعلیم تھا کہ گاؤں سے ٹیلی گرام آیا کہ فوراً گھر پہنچو۔ میں سمجھ گیا کہ میرے خاندان کو کوئی اچانک مسئلہ درپیش ہے۔ میں نہایت پریشان حالی اور پرانگندہ ذہنی کے ساتھ سفر کرتا ہوا گاؤں پہنچا۔ جب میں نے دور سے دیکھا کہ میرے والد کی دکان بند ہے تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بلا سوچے سمجھے میرے قدم، خود خود گھر کی جانب اٹھ گئے۔ گھر پہنچا تو والد محترم کو در و گردہ میں مبتلا پایا۔ وہ درد سے چلا رہے تھے بچے ان کے پاس حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے والد کو کچھ درد کش گولیاں کھانے کے لئے دی تھیں مگر ان سے کچھ افادہ نہ ہوا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اب آپریشن ضروری ہے تاکہ گردہ سے پتھریاں نکالی جاسکیں۔

میں نے دکان کھولی اور اپنے والد کی جگہ دکان پر کام کرنے لگا۔ مجھے اس کا تجربہ

تھا۔ کیونکہ گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں ان کا ہاتھ ہٹایا کرتا تھا۔ کئی دن گزر گئے والد کو آرام نہ تھا۔ ہم اسی لوجیٹن میں تھے کہ کیا کریں؟ ڈاکٹر کی فیسیں ہماری استطاعت سے باہر تھیں۔ اگر فیس کا انتظام کر بھی لیا جاتا تو اس دور میں آپریشن کامیاب ہونے کی کوئی گارنٹی نہ تھی۔ خود میرے ہی ایک چچا، اسی قسم کے ایک آپریشن کے نتیجے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

ہم کیا کریں؟ ایک بھاری غم نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ چیزیں میری آنکھوں کے آگے سمٹ لور سکر کر رہ گئیں۔ میری نگاہ صرف ایک چیز پر جم کر رہ گئی اور وہ یہ کہ.... اللہ ہی کافی ہے۔ میں لوگوں سے باتیں تو کرتا مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

ایک آدمی کھانے کی چیزیں خریدنے کے لیے دکان پر آیا۔ میں نے آپے سودا دیا تو وہ گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ”میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ اس نے قسم اٹھا کر کہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور یہ کہ وہ کل رقم دے جائے گا۔“ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ آدمی واقعی تنگ دست اور پریشان ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”آپ یہ سامان لے جائیے اور اسے میری طرف سے قبول فرمائیے۔“ آدمی چلا گیا مگر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ میں دکان کے ایک گوشے میں چلا گیا اور کہا۔ ”یارب! تیرے نبی ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ **داؤوا مرضا کم بالصدقة**“ اپنے مریضوں کا علاج صدقہ سے کیا کرو“ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس صدقے کی برکت سے میرے والد کو شفا بخش دے۔“ میں زمین پر بیٹھ کر رونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے سنا کہ گھر سے کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ گھر قریب ہی تھا۔ میں جلدی سے گھر گیا۔ میرے عقل و ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ جو خنی میں گھر پہنچا دروازے کے پاس میرے والد ملے اور کہنے لگے۔ ”یہ کنکری نکلی ہے... کنکری لوبیا کے دانے سے کچھ بڑی تھی.... مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے۔ میں اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔“

اگلے دن کی صبح میں کالج میں اپنے دوستوں کے ساتھ شریک درس تھا۔ بے قرار کی پکار سننے والے نے مجھ پر، میرے والد پر اور میرے خاندان پر رحم کیا تھا۔ اس کا بے انتہا شکر ہے۔

## نصابِ تعلیم کے متعلق چند گزارشات

اصول الدین کالج میں، ہمارے مضامین... تھوڑے سے اضافوں کے ساتھ... ایک کامیاب مدرس اور داعی بنانے کے لئے کافی تھے۔ میں انتہائی انکساری کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آج اس دور میں، اسلام کو اسی اسلوب سے پیش کرنا، جیسے چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں پڑھایا جاتا تھا، کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

میں یہ شکایت کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ علمِ اصول فقہ.... ہمارے کالج میں یہ ثانوی مضمون تھا.... بڑے پھیسے انداز سے پڑھایا جاتا تھا۔ اس مضمون کے حقائق کی جو مقدار ہمیں پڑھائی جاتی تھی۔ اس علم کا موجودہ نصاب، اپنے اولین سرچشموں سے مختلف ہے۔ غزالی اور آمدی نے جس طرح اس علم کو پیش کیا ہے، شاطبی نے اپنی موافقات میں وہ انداز اختیار نہیں کیا۔ ان حضرات کا طریق کار ایک لحاظ سے فقہائے احناف کے مسلک کے خلاف ہے۔ اصولِ عامہ کے ساتھ کچھ فقہی قواعد ہیں جن سے شافعیہ اور احناف کے نقطہ ہائے نظر میں تفاوت پیدا ہوا ہے جیسا کہ الزنجانی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علمِ اصول فقہ میں عمرد مہارت حاصل کرنا، کلیۃ الشریعہ میں تخصص کرنے والوں کا کام ہے مگر چونکہ مسلم داعیوں کو مذہبی و فقہی مشکلات و مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے، لہذا ان کے سامنے علمِ اصول فقہ کے معقول خلاصے ضرور پیش کرنے چاہئیں تاکہ اس کے بعد اگر کوئی چاہے تو وہ مزید مطالعہ و تحقیق کر سکے۔

مگر افسوس کہ نہ اصل کالج میں، نہ اس کے ماتحت اداروں میں.. علمِ اصول فقہ پر



خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ خطرہ ہے کہ اگر یہی حال رہا تو کہیں اس علم کو عجب گھروں کی زینت نہ بنا دیا جائے۔

اصول فقہ کے علم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس کا اطلاق علوم حدیث پر بھی ہوتا ہے۔ علم مصطلح الحدیث میں صرف قواعد اور تفریضیں پڑھائی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کی علمی تطبیق و وسیع پیمانے پر ہونی چاہیے۔ جس طرح اسے اب ایک خشک بانجھ انداز میں پڑھایا جاتا ہے، اسے ترک کر دینا چاہیے۔

ہمارے منطق کے استاد، علم منطق کی تعریف کر رہے تھے کہ یہ علم ایک قانونی اکہ ہے جو ذہن کو فکر میں خلا کرنے سے چاہتا ہے۔ ایک رفیق درس نے مجھے اظہار ناگواری کرتے دیکھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر اکہ قانونیہ کی جائے یوں کہ لیا جائے تو کیا ہرج ہے کہ کچھ قواعد ہیں جو عقل کو فکر میں غلطی سے چاہتے ہیں۔“ رفیق درس نے کہا۔ ”نصاب میں مقرر کردہ کتاب ”القطب علی الشمیۃ“ کی بہت سی شرحیں، حواشی اور تقاریر ہیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے کہنے پر ان سب کتابوں کو چھوڑ دیں اپنا فلسفہ رہنے دیجئے۔“ ایک اور صاحب نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے..... مگر انتہائی سنجیدگی سے کہا ”کیا یہ بھی دعوتِ اسلامیہ میں شامل ہے؟“ میں نے کہا۔ ”داعی کے بارے میں مشورہ ہے کہ اس کے پاس ہر باغ کے پھول ہونے چاہئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عظیم داعی حضرات، ماہرینِ فنون سے بڑھ کر، ان فنون پر قدرت رکھتے تھے۔ ابو حامد لام غزالیؒ نے ”تہافت الفلاسفہ“ میں ارسطو اور اس کے گروہ پر کڑی تنقید کرتے ہوئے، ان کے قصورِ فہم اور ان کے اقوال کے سقم و عیوب کو نمایاں کر دیا ہے۔ دعوتِ اسلامیہ تمہارے کسی تارک الدنیا جھکی داعظہ کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ایک فکر ہے، تحقیق و جستجو ہے۔ یہ تو خبیث کو طیب سے اور غلط کو درست سے الگ اور تمیز کرنے کے عمل کا نام ہے۔ یاد رہے کہ ہر معرکہ کا بیادی عنصر انسان ہی ہے۔“

سچ تو یہ ہے کہ ازہر کو ایک تعلیمی و روحانی تجدید کے عمل کی ضرورت ہے۔ یہ فریضہ لو المعزم حضرات ہی ادا کر سکتے ہیں مگر اس تجدید کا موقعہ بھی، جامع ازہر کو ”ناصریوں“ کے ہاتھوں پہنچنے والے نقصانات سے پہلے تھا۔ اب تو ازہر کی رونق ختم ہو چکی ہے اور نمائشی پتلیوں نے اس کی ”قیادت“ کی ہے۔

## ملازمت کی تلاش

میں نے 1941ء میں کالج سے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اب میرے سامنے ”دعوت و ارشاد“ میں تخصص کرنا تھا۔ مجھے ابھی مزید دو سال پڑھنا تھا تا کہ میں ”العالیہ“ مع اجازت دعوت و ارشاد کی ڈگری پاسکوں۔ اگرچہ مجھے ”شہادت العالیہ“ سے بھی روزی روٹی کمانے کے لئے کوئی کام مل سکتا تھا۔ ادھر، میں اپنی مفلسی کے بلوجود، شادی کی بھی شدید خواہش رکھتا تھا۔

ہمارے اس دور میں کسی ازہری کو ملازمت مل جانا محض ایک سانا خواب سمجھا جاتا تھا۔ ازہر کو برباد کرنے اور لوگوں کو دینی تعلیم سے پریشان کرنے کی یہ ایک سرکاری چال تھی۔ ملازمت ملنے کی امید اس وقت پیدا ہوئی جب وزارت اوقاف نے اپنی مسجدوں میں خالی اسامیاں مرنے کے لیے، ”امامت، خطبات اور تدریس“ کی ملازمتوں کے لیے، ازہر کے فارغ التحصیل حضرات کے مابین مقابلے کے امتحان کا اعلان کیا۔

## ملازمت کے لئے انٹرویو اور میری ناکامی

سینکڑوں ”بے کار علماء کرام“ کے ساتھ میں نے بھی اس مقابلے میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ امتحان تحریری بھی تھا اور زبانی بھی۔ زبانی امتحان کے دوران، ارکان کمیٹی اور میرے مابین ایک سخت مجادلہ رونما ہوا۔ اس کی ابتداء میری ناکامی اور کم عقلی سے ہوئی۔ ہوا یہ کہ

کمپنی کے ارکان میں سے ایک صاحب قرآن کریم کے بارے میں مجھ سے سوالات کر رہے تھے۔ مجھے قرآن کریم اچھی طرح یاد تھا۔ میں نے ان کے ہر سوال کا جواب دے دیا۔ اب موصوف نے حفظ کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ان کے سامنے قرآن کریم کا ایک بڑا نسخہ پڑا تھا۔ میں تلاوت کرتا جاتا تھا اور وہ ورق الٹتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک لفظ پر ٹوکا تو میں رک گیا۔ اب میں نے آگے بڑھ کر قدرے جھک کر اس مصحف شریف کی طرف دیکھا جو ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔ کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا۔ ”میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میں نے واقعی غلطی کی ہے؟ اس لیے کہ مجھے قرآن کریم اچھی طرح یاد ہے۔“ کمپنی کے چیئرمین استاد احمد حسن.... ڈاکٹر طاہر حسین کے بھائی.... نے مجھے گالی دی۔ وہ اس وقت مفتی لوقاف تھے۔

اب استاد امین الخولی کی بادی آئی۔ انہوں نے مجھے قرآن کریم کی کچھ آیات کی تفسیر بیان کرنے کے لئے کہا۔ میں نے جواب دیا تو انہوں نے اسے غلط قرار دیا۔ میں نے ان آیات کی تفسیر میں ایک دوسری رائے بیان کی تو انہوں نے اسے بھی غلط قرار دیا۔ اب میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مجھے درست تفسیر معلوم ہو جائے۔ اس لیے کہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ میں بیان کر چکا ہوں۔“ استاد الخولی نے فرمایا۔ ”ایسا سبق کے کمرے میں ہوتا ہے نہ کہ امتحان کی کمیٹی کے روبرو۔“

ڈائریکٹر مساجد شیخ سید زهران نے مداخلت کرتے ہوئے شیخ امین سے کہا بھی کہ، امیدوار نے اپنی بے بسی و کم علمی کا اعتراف کر لیا ہے لہذا اسے درست جواب سے مطلع فرما دیجئے۔ مگر انہوں نے پھر کہا کہ یہاں نہیں۔ اب میں نے اکتا کر کہا۔ اس کا جواب وہی ہے جو میں نے بیان کر دیا ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اس کا کوئی اور جواب نہیں ہے۔ چیئرمین کمیٹی نے ایک مرتبہ پھر مجھے ڈانٹا۔ استاد امین الخولی نے اپنا رخ بدل لیا اور مناقشہ ختم کر دیا۔ اب ڈائریکٹر مساجد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ نے جو تقریر تیار کی ہے

وہ سنائیے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کوئی موضوع بتائیں تاکہ میں اس پر تقریر کروں۔“ چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر، اُن کے دیئے ہوئے موضوع پر فی البدیہہ تقریر کی اور دفتر سے چلا گیا۔

دو ہفتوں کے بعد نتیجہ نکلا، منتخب ہونے والوں میں، میرا پانچواں نمبر تھا۔ اپنے اس انتخاب کو، میں خارقِ عادت سمجھتا ہوں۔ عتبۃ الخضراء کی ”مسجد عزبان“ میں میرا تقریر بطور امام، خطیب اور مدرس ہوا۔ میرے کسی اور ساتھی کو یہ سعادت نہ ملی۔

امامت، خطابت اور تدریس کی یہ سہ کوئی ملازمت ہی جوانی میں، میرا واحد ذریعہ معاش تھی۔ میری ملازمت کا دائرہ کار، ایک مسجد کی چار دیواری تک محدود تھا۔ یہ مسجد اگرچہ زیادہ بڑی نہیں ہے تاہم یہ قاہرہ شہر کے دل میں واقع ہے۔ یہ ایک ایسے بازار کی چار دیواری میں واقع ہے جہاں پورا دن بھر رات گئے تک لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔

مصری دینی لحاظ سے ایک ذکی الحس قوم ہے۔ جب کوئی مقرر دو اعظا لائق و قابل ہو، اپنے موضوع پر حاوی ہو اور بہترین تشریح کرنے والا ہو تو مصری عوام اس کا رخ کرتے ہیں۔ اس کی مسجد کو بھر دیتے ہیں۔ مجھے دینی فرائض انجام دیتے ہوئے ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ مسجد سے ملحق میدان ”العتبہ“ میں بھی صفیں بچھنے لگیں اور میٹروں کے ذریعے خطبہ منتقل ہونے لگا۔

## ایک اہم انکشاف

ایک ماہ کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں تو جاہل ہوں اور یہ کہ میرا علمی اندوختہ چند ہفتوں میں ختم ہو چکا ہے۔ اگر میں نے اپنی علمی تجدید نہ کی اور علم کے سرچشموں سے سیراب نہ ہوا تو مجھے مکمل رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے اچھی طرح تیار کئے ہوئے کچھ لیکچروں اور درسوں پر فخر تھا۔ میں انہی کے آسرے پر ملک میں وعظ کرتا رہتا

تھا۔ مگر اب مجھے ایک ہی منبر سے خطاب کرنا ہوتا تھا ہر طرف سے لوگ وہاں آ جاتے تھے اب مجھے ہر روز درس اور ہر جمعے خطبہ دینا ہوتا تھا۔

اس مسجد میں مجھے ایک بار پھر طالب علم اور شاگرد بننا پڑا۔ دینی و غیر دینی کتابیں میری استاد تھیں۔ اصول الدین کالج کے پرنسپل، مجلس الاذھر الاعلیٰ کی طرف جاتے ہوئے، جب یہاں سے گزرتے تو میں انہیں روک لیتا تاکہ پیش آنے والی مشکلات کے حل میں ان سے مدد لوں۔ میں چونکہ انہیں زیادہ دیر تک روکے رکھتا تھا اس لیے وہ اگر اکٹھا ہٹ کا اظہار کرتے تو میں ازراہ مذاق عرض کرتا۔ ”آپ نے مجھے جمالت کی ڈگری دی ہے۔ اس لیے اب آپ اپنی اس غلطی کا ازالہ فرمائیے۔“ چنانچہ پرنسپل صاحب ہنس کر صبر کرتے اور میری تشفی کرنے کے بعد ہی تشریف لے جاتے۔

اب میں اس مسجد میں، اور اس کے ساتھ ہی دیگر میدان ہائے عمل میں مصروف کار تھا۔ ایک طرف اخوان المسلمون میں شامل تھا تو دوسری طرف علماء وزارت اوقاف سے متعلق تھا۔ مجھے اپنی سرکاری ڈیوٹی اور عوامی خدمت دونوں کو اکٹھا انجام دینے میں کسی تردد یا الجھن کا سامنا نہ تھا۔ میں یہ دونوں کام یکساں محنت اور دلجمعی سے سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک تیسرا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ تھا دعوت و ارشاد میں تخصص کرنا۔ یہ ایک طرح کی طالب علمی تھی، مقصد اپنے تھیوں کی علمی رہنمائی کرنا تھا۔

## مسجد کے افتتاح کے لیے شاہ فاروق

## کی آمد اور ایک دلچسپ واقعہ

میں یہاں ایک دلچسپ قصہ بیان کرتا ہوں جو مجھے امامت کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ ڈائریکٹر مساجد، میرے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ میرا زبانی امتحان لینے

والے بورڈ کے ایک رکن تھے۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنے دفتر بلوایا اور بتایا کہ محلہ ”المنیل“ میں مسجد کا افتتاح کرنے کے لیے شاہ فاروق تشریف لائیں گے۔ تم ایک مناسب خطبہ تیار کر لو کیونکہ جمعہ کی نماز تم نے ہی پڑھانی ہے۔

جمعرات کے دن میں وزارتِ لوقاف کے دفتر گیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے مجھ سے خطبہ لیا۔ اسے دیکھا پھر اسے منظور کروانے کے لیے قصر عابدين چلے گئے۔ وہاں سے منظور ہو چکا تو انہوں نے محل سے، ٹیلی فون کے ذریعے، مجھ سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”کل کے خطبہ کے لئے تیاری کر لو۔ احتیاطاً کل صبح میرے گھر آ جانا، وہاں سے اکٹھے مسجد جائیں گے۔“ جمعہ کی صبح میں ان کے گھر پہنچا تو نوکر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ میں ڈائریکٹر صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں وہ آئے۔ مجھے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ کچھ سنبھلے تو غصے سے پھٹے پڑتے تھے۔ وہ کچھ لفظ بڑا رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ پھر اپنے آپ پر قابو پایا اور کہنے لگے یا استاذ! تم جلالہ الملک کو نماز پڑھانے آئے ہو تو اس پر انے خجے تو اس معمولی سے لمبے کرتے میں؟ یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوئی۔ مگر جلد ہی میری ہنسی مذاق والی طبیعت غالب آگئی۔ میں نے کہا۔ ”جُبہ تو لہجہ ہے مگر لمبا کرتا، جیسے شیوخ پہنتے ہیں شوخ و لچکدار، مجھے وہ پسند نہیں۔ پھر آپ یہ نہ بھولیے کہ میں نے اس لباس میں آپ سے ملاقات کی ہے۔ آپ اور بادشاہ مراد ہیں۔“ ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ یا استاذ! کچھ پروٹوکول بھی ہوتے ہیں۔

اس پریشانی سے نکلنے کے لیے وہ کچھ سوچنے لگے۔ انہوں نے انسپکٹر مساجد کو بلوا بھیجا۔ یہ صاحب ذیل ڈول میں مجھ سے قدرے ملتے جلتے تھے۔ اُن سے اعلیٰ ملبوسات مستعار لیے اور مجھے پہننے پر مجبور کیا۔ وہ انسپکٹر صاحب مجھ سے تھوڑے لمبے تھے۔ لہذا مجھے سمجھا دیا کہ لباس کو اندر سے کیسے سنبھالنا ہے۔

نماز خیریت سے مکمل ہوئی۔ جب تک شاہ فاروق چلے نہیں گئے ڈائریکٹر مساجد

بہت پریشان ہوئے عین رہے۔ نماز کے بعد وہ مجھے گھر تک چھوڑنے آئے وہ ان حالات کو کوس رہے تھے جن میں ان کا میرے ساتھ تعلف ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ اللہ کا شکر بھی ادا کر رہے تھے کہ سب کام خیر و خوبی اور رازداری کے ساتھ سرانجام پائے۔ مگر میں ان کی ان باتوں پر ہنس رہا تھا اور کہتا تھا کہ کیا ان ”مبوساتِ عالیہ“ سے جان چھڑانے کا کوئی طریقہ ہے؟

اس دلچسپ واقعہ کے باوجود، میری اور ان کی دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ میں کئی علمی مسائل میں ان کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

## شادی خانہ آبادی

سرکاری ملازمت ملتے ہی میری شادی بھی ہو گئی۔ میری شادی کے مسئلہ میں کچھ پیچیدگی پیدا ہوئی مگر استاد حسن البنانے اس میں مداخلت کی۔ میں نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا، اس کا والد میرے جائے کسی زیادہ مال دار آدمی سے اس کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی کا والد میرے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ قاہرہ میں وزارتِ انصاف میں ملازم تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میری تن خواہ صرف چھ گنتی ہے، جس میں سے تقریباً آدھی تنخواہ میں اپنے والد کو بھیج دیتا ہوں... مگر استاد المرشد نے اُس آدمی کو قائل کر لیا کہ میں دوسروں سے بہتر ہوں۔ مستقبل اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انشاء اللہ مستقبل اچھا ہوگا۔ چنانچہ میری شادی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد استاد المرشد نے مجھ سے پوچھا کہ فلاں آدمی..... یعنی میرے سر..... کے ساتھ کیا بات چیت ہوئی؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ ناراض ہو کر فرمایا۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بلایا؟ پھر مسکراتے ہوئے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا۔

واذا تكون كريمة ادعى لها.. واذا يحاس الحبس يدعى جندب

میں نے کہا۔ ویسے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہم نے بیٹھے شریعوں پر ہی گزارہ کیا۔ کچھ دوست آئے تھے۔ انہوں نے یہ ثمرت پیئے۔ سر صاحب نے اپنے گھر کا ایک کمرہ مجھے دے دیا ہے۔ اور اللہ کا شکر ہے..... المرشد نے ہمارے لئے نیک کت کی دعا کی۔

## رفیقہ حیات کی جدائی

دنیا کے خوش قسمت ترین جوڑے کی طرح رہتے ہوئے ہم میاں بیوی نے تیس سال گزارے۔ وہ چونکہ میری تنگ دستی کے باوجود، میرے ساتھ شادی پر خوش تھی، اس لئے میں نے اُسے کسی طرح کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ میں نے اُسے بہترین گھر میں ٹھہرایا۔ عمدہ سے عمدہ کھانے کھلائے، پہننے کے لئے ریشم اور سونا دیا۔ ہمارے نوپے پیدا ہوئے۔ ان میں سے دو رب کریم نے واپس لے لیے۔ سات بچے چچیاں موجود ہیں۔ پھر میری رفیقہ حیات، اس دنیا سے چلی گئی۔ میں اس کی وفات پر خوب رویا اور کسی کے یہ شعر پڑھے۔

اما والذی ابکی واضحك والذی... امات واحیا والذی امره الامر  
لقد ترکنتی احسد الطیر ان اری... الیقین منها لا یرو عھما الذعر  
اللہ تعالیٰ اس پر اپنی وسیع رحمت نازل فرمائے اور علین میں اس کے درجات بلند کرے۔

میں اب اس ”آہ“ کو چھوڑتا ہوں اور نوجوانی کے ایام، زندگی کے تلخ دنوں اور مسلسل محنت و جان فشانی کی باتوں کا تذکرہ کرتا ہوں۔

## اس وقت مسلمانوں کی حالتِ زار

اپنے بارے میں کچھ بیان کرنے سے پہلے میں، اپنی قوم پر گزرنے والے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔



دوسری عالمگیر جنگ، انگلستان، فرانس اور امریکہ کی فتح کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اگرچہ ہماری سر زمین پر، اس جنگ کے کئی معرکے لڑے گئے تھے تاہم مسلمان اور عرب اس جنگ میں معمولی عنصر تھے۔ ہماری تمدنی پس ماندگی انتہا پر تھی۔ پھوٹ نے ہماری اہمیت کو پارہ پارہ اور ہمارے دبدبے کو ختم کر دیا تھا۔ ہماری کوششوں کو بے وقعت اور ہماری کاوشوں کو بے کار بنا کر رکھ دیا تھا۔ مسلط کباد کار یعنی غاصب سام راج سے نفرت اتنی شدید ہو گئی تھی کہ اسکندریہ میں ایک نوجوان نے نعرہ لگایا: رو میل آجاؤ۔ رو میل ایک جرمین سپہ سالار تھا جو صحرائیں منتشر رہی سہی انگریزی فوج کا خاتمہ کر رہا تھا۔ میں ان لوگوں سے عربوں کی نفرت سمجھتا ہوں جنہوں نے ہماری سر زمین پر اسرائیل کی تحمیریزی کی۔ اس وقت تک اسرائیل برطانوی حکم میں جنین کی صورت میں تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایک نوکباد کار کے جانے دوسرے استعمار کو لانے کا کیا فائدہ؟ یہ غلط رجحان ایک خوف ناک خلا کی نشان دہی کرتا ہے جو لوگ ہماری اہمیت کو صحیح رخ پر چلانا چاہتے ہیں انہیں اس خلا کو پر کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

حسن البنایجب قوم کو بیدار کرنے میں، پوری بے دار مغزی سے مصروف جدوجہد تھے تو اس وقت مصر میں وفد پارٹی کے سوا، دیگر سب پارٹیاں کاغذی تھیں۔ البتہ وفد پارٹی کسی بھی آزادانہ ہونے والے انتخابات میں 90 فی صد نمائندگی کی اہل تھی۔ باقی پارٹیاں شاہی محل کے محور میں گھوم رہیں تھیں۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ قومی نمائندے اقتدار سے لٹکیں تو وہ جعلی انتخابات کے سائے میں اقتدار پر اجماع ہوں۔

اس وقت کی مذہبی صورت حال کو، اس کے صحیح تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ اصلی یا نقلی سب سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور نمائندے مسلمان تھے۔ ان کے ذہن میں مذہب کا تصور وہی تھا جو اہل مغرب نے دے رکھا ہے۔ ان کے نزدیک مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرانی ویٹ تعلق کا نام ہے۔ جس کا اظہار عبادت، اخلاق اور خاص طرز عمل میں

ہوتا ہے۔ باقی رہا دین کا یہ تصور کہ وہ انسانوں کے مابین تعلقات کو مضبوط کرتا ہے اور اس کی تعلیمات کا نفاذ، معیشت اور حکومت کے معاملات میں ہونا چاہیے، یہ لوگ دین کے اس تصور سے نا آشنا تھے۔

کچھ ایسے سیاست کار بھی تھے جو مذہب سے ہی بے زار تھے، اُس کے عقائد اور اس کے قوانین سے، یہ مشرق و مغرب کے لٹھروں کے پتے پیر و کار تھے۔ پہلا گروہ ہویا دوسرا، دونوں، جماعتِ اخوان اور ان کی دعوت سے بے زار تھے۔ وہ یا تو اس دعوت کو مکمل نظر انداز کرتے یا سختی کے ساتھ اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے تھے۔

## ایک ناکام کوشش

میں جب کتبہ اصول الدین میں دعوت و ارشاد میں قصص کر رہا تھا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اسلامی آئین سازی کے لیے ایک اتحاد قائم کیا جائے جو دیگر طلبہ تنظیموں کا مقابلہ کرے۔ معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لیے زمین ہموار ہے۔ ہم نے جلد ہی دیگر طلبہ تنظیموں کا صفایا کر دیا۔ ہم نے ہزاروں پمفلٹ چھاپے اور بانٹے۔

ہم نے وزیرِ اعظم مصطفیٰ نچاش پاشا سے ملاقات کا وقت مانگا تا کہ باہمی مفاہمت کے لیے بات چیت ہو سکے۔ اُس نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور کہا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھنے والا ہے اور ہمارے علماء اور مشائخ سے بڑھ کر ایمان دار ہے۔ وہ جیل میں بھی نماز پڑھتا رہا ہے، اس نے وہاں بھی نماز نہیں چھوڑی۔ پھر اُس نے ہم پر تنقید شروع کر دی جو گالیوں سے مشابہ تھی..... مجھے تو وہ ایک غیر سنجیدہ آدمی نظر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عوام میں اس کی مقبولیت کی وجہ اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے۔ میں نے اُسے تلخ و تند باتوں کا مزید موقع نہ دینے کا فیصلہ کر لیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”آپ ایک ایسے ملک کے حکمران ہیں جہاں بدکاری کے باقاعدہ اجازت نامے

دیئے جاتے ہیں۔ جس میں شریوں کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ جس میں اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کیا جاتا ہے۔ یہ جو آپ اپنے ایمان اور نماز کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی عکاسی ملک میں کہاں ہوتی ہے؟“

میں نے تحریری صورت میں اپنے مطالبات پیش کیے تو وزیر اعظم نے وہ کاغذ میرے منہ پر دے مارا۔ معاون وزارت امور مذہبی شیخ محمد الہنا، وزیر اعظم کے ساتھ تھے۔ انہوں نے نہایت ادب و احترام سے کہا۔ ”ٹھہریے! رفعت پاشا! یہ لوگ انسانی اصطلاحات کا مطالبہ کر رہے ہیں جن کے بارے میں خود آپ غور و فکر کرتے رہے ہیں اور اس بارے میں آپ کی میرے ساتھ بات چیت ہوئی ہے۔“ چنانچہ وزیر اعظم نے مطالبات والا کاغذ لیا اور ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔

اکتا دینے والی صحت کے بعد ہم واپس آئے۔ جب استاذ المرشد کو خبر ہوئی تو انہوں نے مجھے طلب کیا اور اتحاد تکمیل دینے اور اسے اس مرحلہ تک پہنچانے پر مجھے کوسا۔ آپ نے مجھے سمجھایا کہ صرف اخوان کالائٹ عمل ہی مطلوبہ ہدف تک پہنچنے کے لئے مناسب ہے خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ لگ جائے۔ لہذا میرے لیے بھر پوری ہے کہ میں اپنی تمام تر کوششیں اس لائحہ عمل پر کام کرنے پر مرکوز کر دوں۔ چنانچہ میں نے آپ کی بات مان لی اور اتحاد ختم کر دیا۔

اب میں نے دعوت و تبلیغ کا کام از سر نو پوری شدہ ہی سے شروع کر دیا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ مرہد عام نے مجھے اخوان المسلمین کت مجلہ کا سیکرٹری بنا دیا۔ میں اب رسالہ میں لکھتا تھا۔ کبھی اپنے دستخطوں سے کبھی دوسرے دستخطوں سے۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے دفتر میں بھی باقاعدہ جارہا تھا۔ یوں میں مسجد میں اپنا سرکاری کام اور رسالہ کی ادارت کے فرائض کو بہ یک وقت سرانجام دے رہا تھا۔

## جمہوریت

مختلف اوقات و حالات میں، جو متعدد حکومتی ڈھانچے تشکیل پائے ان کا میرے حاضر و مستقبل پر گہرا اثر پڑا۔ مصر کے وزیراعظم اور وفد پارٹی کے سربراہ مصطفیٰ نحاش پاشا سے ملاقات کے بعد میں نے اپنے دوستوں سے کہا۔ یہ ہے مغربی جمہوریت.... اپنے اپنے برے پہلوؤں کے ساتھ... ہم نے وزیراعظم سے ملاقات کا وقت مانگا تو انہوں نے ملاقات کی۔ ہمارے بارے میں اپنی رائے ہمیں سنائی۔ ہم نے اپنی رائے سے انہیں آگاہ کیا۔ ان کے ایک معاون بھی ان کے ساتھ تھے۔ ملاقات کے بعد ہم اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نہ کسی ملازم کا بد طرف کرنے یا تبدیل کرنے کا فرمان جاری ہوا نہ کسی طالب علم کو تعلیمی ادارہ سے نکالا گیا نہ کسی کو گرفتار کیا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب استاد حسن البنا نے اسماعیلیہ کے حلقہ سے منتخب ہونے کے لیے یہ طور امیدوار کاغذات جمع کرائے تو وزیراعظم نحاش پاشا نے انہیں بلوایا اور کہا۔ ”انگریز، پارلی منٹ میں آپ کے آنے پر راضی نہیں ہیں۔ میں انتخابات میں جعل سازی، دھاندلی اور فریب کاری سے کام لیتا نہیں چاہتا۔ کیا آپ ہمیں اس پریشانی سے نکال سکتے ہیں؟ اور اپنی مرضی سے انتخابات سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ آپ سے ہمارا وعدہ ہے کہ ہم دعوت کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے بھر طیکہ آپ پارلی منٹ سے دور رہیں۔“ استاد المرشد نے یہ مسئلہ اخوان کے سامنے رکھا تو ان کی اکثریت نے اس کی تائید کی۔ چنانچہ وہ انتخابات سے دست بردار ہو گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مرکز عام میں وفد کے وزراء آئے۔ انہوں نے دعوت کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کیں چنانچہ اخوان کی شاخوں میں کافی اضافہ ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ اسباب کی وجہ سے فریقین کے مابین یہ پُل جلد ہی ٹوٹ گیا۔ میرے خیال

میں، دونوں فریق ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ وفود والے، اخوان کے پھیلنے ہوئے اثر و رسوخ سے حسد کرنے لگے وہ مسلم داعیوں کے لیے، مصریوں کی گرم جوشی سے کیے گئے خیر مقدم سے بھی جلتے لگے۔ وہ لوگ حسن البنا کے بارے میں عامیانہ طنز سے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔ ان کے بارے میں کہتے کہ ”وہ معمولی ملازم ہے“۔ ”عربی زبان کا مدرس ہے“۔ یا ”خطاطی کا استاد ہے“۔ وغیرہ۔

جماعت کے محاون استاد احمد سکری۔ اخوان اور وفد پارٹی کے مابین ہمزہ وصل تھے۔ جب کہ ایک اور صاحب اخوان... لور... شاہی محل اور اس کی پارٹیوں کے مابین قریبی تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ تھے استاد منیر الدلہ... رحمہ اللہ۔ اخوان نے استاد سکری کو الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وفد اور اخوان کے مابین تعلقات نہ صرف کشیدہ ہوئے بلکہ دونوں میں ٹھن بھی گئی۔

مجھے ایک تحریک کے دوسری تحریک پر غالب آنے یا ایک شخص کی جگہ دوسرے شخص کے آنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ اسلام کے بارے میں یہ نہ کہا جائے کہ وہ سیاسی استبداد کا مدگار ہے لور یہ کہ اسلامی فکر، انسانی آزادیوں سے چشم پوشی کرتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمام مصری پارٹیاں، اسلام کے سماجی اصولوں سے نا آشنا ہیں۔ نہ ہی وہ کوئی ایسا مناسب طریقہ جانتی ہیں جس سے ہماری بیماریوں کا علاج ہو سکے۔ ان کے پاس، اس تہذیب کی خرابیوں کا مداوا کرنے کا بھی کوئی سامان نہیں ہے جو ہم پر یلغار کر چکی ہے۔

ہم لوگ اخوان کی دعوت کے ذریعے جس لائحہ عمل پر کاربند تھے، میری نظر میں وہ عوام کے لیے ایک بہترین اور مفید چیز تھا... حسن البنا... جیسا کہ میں نے انہیں جانا... ایک عبادت گزار قائد، ایک ثابت قدم مجاہد، ایک باصلاحیت مرقی اور ایک ان تھک

داعی تھے۔ وہ اپنا ایک لمحہ بھی، اسلام کے سوا کسی اور عمل میں ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

## عالمی نظام

میں نے اخوان کے لائحہ عمل اور المرشد کی شخصیت کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اختلاف اگر تھا تو وہ صرف تطبیق میں تھا۔ میں اس جزئی اختلاف کے باوجود، اس قافلے کا ہم رکاب رہا جو اللہ اور اسلام کا علم بردار تھا۔ میں نے حمیہ کر لیا کہ اخوان کا ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ، میں ایسی کتابیں لکھوں گا جن میں اسلامی تعلیمات کے اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا جنہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔

ایک دن میرے ایک دوست نے میری نفسیاتی شکست و رخصت کی حالت سمجھتے ہوئے کہا: ”گویا کہ آپ مغربی جمہوریت کو پسند کرتے ہیں۔“ میں نے کہا: ”جی ہاں۔ میں نے انگریز قوم کو دیکھا ہے جو اپنے وزیراعظم چرچل سے..... جس نے انہیں جنگ جیت کر دی ہے... کہتی ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے۔ ہمیں اس وقت کچھ اور صلاحیتوں کے حامل شخص کی ضرورت ہے۔ چرچل مسکراتے ہوئے اس فیصلے کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے گاؤں جا کر بچوں سے کھیلتا ہے اور آرام کرتا ہے، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔“

دوست نے پوچھا: اشتراکیت (سوشل ازم) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا: میں عنوانوں سے دھوکہ نہیں کھاتا، انگلستان کے سرمایہ دارانہ نظام نے محنت کش طبقوں کو وہ حقوق دیئے ہیں جن کا روسی مزدور تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ انگریز ایک غریب مگر خوش حال قوم ہے۔ امریکی مال دار ہیں مگر خوش حال نہیں۔ جب کہ روسی نہ مال دار ہیں نہ خوش حال۔

مال و دولت بہر حال نفسیاتی و سماجی استحکام کا ایک ذریعہ ہے۔ مال کے بغیر چارہ

نہیں مگر مال ہی سب کچھ نہیں۔ میں کسی ایسی آزادی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جس کے ساتھ مال داری نہ ہو اور میں کسی ایسی مال داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں جس کے ساتھ آزادی نہ ہو۔ ہم مسلمان دینی فطرت کو ماننے والے ہیں۔ ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرنا کتنا معقول ہو گا کہ وہ مادی اور اخلاقی عزت و وقار کے بغیر زندگی گزارے۔

میں انہی مطالب کو اپنی نئی نسلوں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ وہ درآمد شدہ اصولوں کی طرف نہ دیکھے اور اپنے دین کے بارے میں کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ وہ ایک چلا ہوا کارٹوس ہے جو زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے کسی علت کی تشخیص میں یا علاج تجویز کرنے میں غلطی کی ہو۔ مجھے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں۔ میں غلطی کا اعتراف کرنے اور حق کو قبول کرنے میں خلل سے کام نہیں لیتا۔ میں تو خطا پر متوجہ کرنے والے کا شکر گزار ہوں گا اور اس کی برتری کو تسلیم کروں گا۔

## ایک صابر و شاکر محنت کش کا بادی آرام

میں حقہ الخضراء میں واقع اپنی مسجد میں اور اخوان کے مرکز عام حلیہ میں کام کرتا تھا، اچانک ٹیلی گرام ملا۔ مجھے گاؤں پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے والد تھک چکے ہیں مگر مجھے یہ احساس نہ تھا کہ ان کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوا۔ میں کسی اطلاع کا منتظر تھا، لوگوں کے چہروں سے بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ میری نظر دور سے اپنی دکان پر پڑی۔ میرا بھائی وہاں کھڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ والد محترم ہمارے لہذا میں سیدھا گھر گیا۔

والدہ محترمہ رورہی تھیں۔ وہ میرے والد کی پائنتی بیٹھی تھیں۔ میں نے سلام کیا۔ والد صاحب کا ہاتھ پکڑا اور احترام و محبت سے پچوم لیا۔ والد نے میری طرف دیکھا اور مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ ایک ڈبیہ اور دو اکی کچھ بوتلیں قریب رکھی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر

کیا ہے اور اس نے یہ دوائیں، استعمال کرنے کے لیے کہا ہے۔ مگر ان دواؤں کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ میں گیا اور ایک بار پھر ڈاکٹر کو لے گیا۔ کیونکہ والد کی خراب حالت نے مجھے پریشان کر ڈالا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کی۔ میں سمجھ گیا کہ والد، پیشاب کی کئی ہزار یوں میں مبتلا ہیں جن پر قابو پانا دشوار ہے اور ہو سکتا ہے کہ غدہ مثانہ کے بڑھ جانے سے پیشاب ہی بند ہو جائے۔ والد کی جسمانی حالت، کسی آپریشن کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم سب گھر والے باری باری والد کی تیمارداری میں مصروف رہتے۔ والدہ کے اصرار پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو بلوایا مہجرتا کہ وہ مسلسل بخوتی ہوئی صورت حال کا کچھ علاج کر سکیں مگر انہوں نے آنے سے معذرت کر لی۔ وہ مایوس ہو چکے تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد، میں کافی دیر تک سو یا رہا کیوں کہ میں نے گزشتہ پوری رات جاگ کر گزاری تھی۔ پھر میں والد محترم کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے ان کے پاس ہی نمازیں پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ عشاء کی نماز کے بعد، میں ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایک عجیب رات تھی، گھر کا ہر فرد تھک کر سو چکا تھا۔ صرف میں اپنے والد کے پاس بیٹھا جاگ رہا تھا۔ والد نے نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔ میں مرنے ہی والا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔ دیوار میں مٹی کے تیل سے جلتے والا دیار کھا تھا۔ مجھے احساس ہوا جیسے اس کی بستی کپکپائی ہو؟ میں نے دل میں سوچا۔ کیا موت کا فرشتہ اندر آیا ہے؟ جس کے پروں کی حرکت سے دیئے کی لو پھڑ پھڑا رہی ہے۔ میں نے والد کی طرف کان لگائے۔ سنا تو وہ میرے لیے دعا کر رہے تھے۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

صبح جب لوگ میت کو اٹھانے لگے تو میری والدہ اپنے مرحوم شوہر کی لاش کے قدموں سے لپٹ گئیں اور پاؤں چومنے لگیں۔ وہ اُن کے پاؤں میں اپنا چہرہ چھپا رہی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ بڑی مشکل سے انہیں لاش سے الگ کیا گیا۔



گھر میں سب رو رہے تھے۔ میں بھی زار و قطار رونا چاہتا تھا مگر ایسا نہ کر سکا۔ مجھے اپنے اوپر قابو رکھنا تھا۔ میں اب اس خاندان کا سربراہ تھا۔ میرے گرنے سے وہ سب گرتے۔ مجھے اپنے باپ جیسا بننا تھا۔ میرے والد ظاہری کی کرتے تھے کہ سارے معاملات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ اللہ پر بھروسے کے سوا، ان کے قبضے میں کچھ نہ تھا۔ مسلم خاندان کو مضبوط کرنے والے رشتے کتنے عظیم ہیں۔ میں جب قاہرہ جانے کے لئے، اپنا کام نئے سرے سے سنبھالنے کے لیے، گھر والوں سے جدا ہونے لگا تو میں نے والدہ اور بھائیوں سے کہا۔ ”میرے والد فوت نہیں ہوئے۔ میں ان شاء اللہ سب کا خیال رکھوں گا۔ جب تک کہ میرے بھائی تعلیم مکمل نہیں کر لیتے اور جن بہنوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ان کی شادیاں نہیں ہو جاتیں۔“ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے میرے اس بیان کو پورا کر دیا۔

## اخوانی واعظ

میں پہلے کہیں اس امتیازی کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جو قدرت نے مجھے عطا فرمایا تھا۔ یعنی میں عوامی اور سرکاری دونوں فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ چنانچہ مجھے مختلف محافل و مساجد میں بھرپور انداز سے خطاب کرنے کا موقع ملتا تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جب بھی کسی معاملے پر گفتگو کروں تو اس کے علمی عناصر کو مکمل کروں اور انہیں معقول اسلوب سے مختلف مواقع و حالات سے باہم مربوط کروں۔ میں اپنی ہر تقریر کو حکمرانوں کے ”قرب“ سے چاتا تھا، میں صریحاً اشارہ یا کوئی ایسی بات نہیں کرتا تھا جس میں حکمرانوں کی رضا جوئی پائی جاتی ہو۔ میں وہی کہتا جو میرے دین کا تقاضہ ہو یا جس میں میرے رب کی رضا ہوتی۔ حکمران میرے اس طرز عمل سے بلا کھلا گئے مگر وہ میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں متردد تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں نے ایک کتاب ”الاسلام والاستبداد السياسي“

ہمیں۔ یہ کتاب ”طور سینا“ میں نظر بندوں سے میری گفتگو و خطاب کی تلخیص تھی۔ یہ کتاب فرعونوں سے نفرت و کراہیت کا مظہر اور فرد واحد کی حکمرانی کی برائیوں کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اس میں حکومتی پالیسیوں کے بارے میں، اسلامی نقطہ نظر کی کھل کر ترجمانی کی گئی تھی۔

## جمہوری آزادیوں سے استفادہ

میں اپنی تقریروں اور پھر اس کتاب کی وجہ سے حکومتی حلقوں میں ایک طرح سے Black List ہو چکا تھا۔ اخوان المسلمون کی جماعت پر قانونی پابندی عائد ہو چکی تھی مگر ہم نے اس صورتِ حال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم پورے ملک میں پھیل گئے اور خوش اسلوبی سے اپنا حیات اور پیغام پھیلانے میں لگے گئے۔

اس وقت آئینی و دستوری حالات سے ہم نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ہم نے مل کر اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ یہ کتاب جانے ہو گا کہ اس دوران تحریک اسلامی نے زیادہ زور پکڑا اور اس کے ساتھ تعاون و حمایت میں اضافہ ہوا۔ ہم میں سے اکثر کو درپیش مصائب و مشکلات کے باوجود، ہماری قوم کے دینی مزاج اور اللہ تعالیٰ کی اپنے دین کی حفاظت کی وجہ سے، پرچم اسلام ایک بار پھر سر بلند ہونے لگا۔

اس دوران ہندوستان سے استاد ابو الحسن علی ندوی تشریف لے آئے۔ یہ ایک طرح کی تہمید غیبی تھی۔ ہم اکٹھے دارالحکومت قاہرہ سے صوبوں میں جاتے۔ ہم اللہ کی طرف بلا تے، لوگوں کو اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے کی دعوت دیتے۔ میرے اور ندوی صاحب کے زیادہ تر نظریات و خیالات میں ہم آہنگی تھی۔ ہمارے اخوان نے اسے حسن اتفاق قرار دیا۔ ہم سب اس یک رنگی و ہم آہنگی پر خوش تھے۔

مصری عسکری انقلاب سے پہلے کے چار سال، ہماری مصری تاریخ پر اثر انداز محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہونے کے لحاظ سے بہت اہم تھے۔ اخوان نے دستوری آزادیوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا، اپنی قوت مجتمع کر لی اور اپنی ہمت کو یقینی بنالیا۔

## سیاسی حالات اور جماعتِ اخوان

اقلیتی پارٹیوں کا دور ختم ہوا۔ وفد پارٹی اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھی۔ اسے شان دار کامیابی حاصل ہوئی۔ استاد مصطفیٰ امین نے جو وفد پارٹی کے دشمن مبین تھے، استعفیٰ نتیجے پر تسمہ کرتے ہوئے کہا تھا: لکَل داء دواء الا الوفد۔ ”ہر صمدی کا علاج ہے سوائے وفد پارٹی کے۔“

میں کبھی بھی وفد پارٹی سے منسوب نہیں رہا۔ میں تو جب اسکندریہ کے دینی ادارے میں رابعہ ثانویہ کا طالب علم تھا اس وقت حسن البنا سے متعارف ہوا۔ مجھے اس عظیم انسان کی شاگردی پر ناز ہے۔ حالانکہ میں دینی و دنیوی تعلیم میں بہترین تھا اور ان تمام علموں سے محفوظ تھا جو فسادِ فکر و نظر کا باعث بنتی ہیں۔ مجھے اس امر کا یقین ہے کہ اگر وفد پارٹی اور اخوان المسلمون دونوں قومی جماعتوں میں مفاہمت ہو جاتی تو مصر اس ہولناک بحران میں مبتلا نہ ہوتا جس میں وہ واحد میں مبتلا ہوا۔

مجھے ان دونوں پارٹیوں کے مابین اتحاد و مفاہمت محض اس لیے عزیز تھا کہ اس طرح 1923ء کا مصری دستور برقرار رہے گا۔ گویا ان دونوں پارٹیوں کا اتحاد، اس دستور کی بقا کی ضمانت تھا۔ یہ دستور مصریوں کو وہ آزادیاں فراہم کرتا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ڈکٹیٹر اپنی من مانی کارروائیاں نہیں کر سکتے۔ نیز یہ غریبوں اور کم زوروں کو ذلت و خواری سے چھاتا اور انہیں مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے۔

میں ایک مسلم داعی کے طور پر حریت و آزادی کو عزیز رکھتا ہوں اس لیے کہ میں صرف اسی صورت میں اپنا فرض ادا کر سکتا ہوں اور اپنا مشن مکمل کر سکتا ہوں جب مجھے

آزادی حاصل ہو۔ اگر کبھی میرے پاس آزادی نہ رہی تو میں اپنا پورا وجود کھودوں گا۔ اسلام کو پھیلنے اور فتحیاب ہونے کے لیے اس آزادی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر کچھ کوتاہ بین لوگ، اپنے مقاصد میں ناکام حضرات، اس حریت و آزادی سے خوف زدہ ہیں تو پھر انہیں دعوت و تبلیغ کا میدان چھوڑ کر کوئی اور کاروبار شروع کر دینا چاہیے۔ دعوت و تبلیغ کا اعلیٰ کام ان کے بس کا روگ نہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اخوان اپنے مرشد کے قتل اور ایک سگ گزیدہ استبداد کے سائے میں اپنی جماعت پر پابندی کے بعد، مصر میں انسانی حقوق کے تحفظ اور عوامی مراعات و حریت کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کریں گے مگر کیا ایسا ہوا؟ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ معاملات کسی اور رخ پر چل پڑے۔

میں ”الطور“ میں تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ اخوان بالعموم، اپنی پالیسی کے بارے میں کسی قسم کا اعتراض یا شکایت سننے کے روادار نہیں۔ مجھے یہ سن کر دکھ ہوا۔ میں نے کہا کہ غزوہ احد میں شکست کے بعد، اگر کچھ صحابہ کے طرز عمل پر، قرآن شریف میں تنقید کی گئی تو پھر ہمیں بھی اپنے خاص و عام و طیلوں، طریقوں اور عملوں پر نظر ثانی اور اعتراض سننے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کسی قبیلے کی ضرورت ہو۔ یا ہم لائحہ عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ مگر افسوس کہ اس سوچ کو پذیرائی نہ مل سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ دین داروں کی اکثریت، سیاسی فکر میں کوتاہ بین اور کم فہم واقع ہوئی ہے۔ ان حضرات کو فساد نظر آتا ہے مگر وہ اس کے سبب کو نہیں سمجھتے، یہ لوگ تاریخ پڑھتے ہیں مگر اس کی عبرتوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارا ماضی درخشندہ تھا مگر یہ اس درخشندگی کا سبب نہیں جانتے، انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہم فلاں دور میں شکست سے دوچار ہوئے تو یہ لوگ اس ہزیمت کے باعث سے ہائشمار جتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیائے مغرب کا ستارہ چمک رہا ہے مگر اس چمک کے پیچھے کیا ہے؟ یہ حضرات اس سے بے

خبر رہتے ہیں۔

## آئین و دستور کے بارے میں ایک صاحب سے مکالمہ

ایک صاحب بزمِ خویش دعوائے ہمہ دانی کے ساتھ، مجھ سے بحث میں الجھ رہے

تھے۔

میں نے ان سے پوچھا: 1923ء کے دستور میں اور ناصری انقلاب کے بعد بننے

والے دستور میں کیا فرق ہے؟

انہوں نے قدرے حیرت سے کہا: مجھے نہیں معلوم اور اس نہ جاننے سے میرا کچھ

بجوتا بھی نہیں۔

میں نے کہا: آپ صرف اس بات پر شور مچانا چاہتے ہیں کہ جوتے کے ساتھ یا بغیر

جوتے کے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ آپ صرف اس بات پر بحث کرنا جانتے ہیں کہ عورت کو

جھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں۔ مگر جب بات پہنچے کسی حکمِ ران کی آمریت تک، وہ آمر

جو گھروں کو اجازت اور جیلوں کو ہساتا ہے، عزت و ناموس کو پامال کرتا ہے اور خان دانوں کو

خوف زدہ کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں۔ کہ اس طرزِ عمل کے اسباب سے ناواقفیت کا مجھے کچھ

نقصان نہیں۔

”کتاب و سنت کی طرف واپسی“ کا نعرہ بلاشبہ دل کش ہے مگر اس نعرے کی دل

کشی میں کھو کر ہمیں فرعونوں کو اس بات کا موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ اپنے بنائے ہوئے آئین

کا سہارا لے کر ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہیں۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ آئین

کیوں بنایا گیا اور کیسے بنایا گیا؟

ایک اور صاحب جو ہماری اس بحث کو سن رہے تھے، مجھ سے کہنے لگے۔ ”آپ یہ

بات فراموش نہ کریں کہ جس آئین کی آپ تعریف کر رہے ہیں، یہ باہر سے درآمد کیا گیا

ہے۔“ میں نے کہا: ”میں اسے بھول نہیں رہا۔ یہ واقعی ترجمہ شدہ ہے اور جدید یورپی آئینوں سے نقل کیا گیا ہے۔ مگر باہر سے آنے والی ہر چیز ضروری نہیں کہ عیب دار ہو۔ ان قانونی اصولوں کے ذریعے قوم کو متوقع مظالم سے بچنے میں خاطر خواہ مدد ملی ہے۔“

”مصر میں رہتے ہوئے اگر ہم کسی درپیش مرض سے چمٹا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں باہر سے درآمد کردہ کسی خرب نسخے پر بہر حال اعتماد کرنا ہوگا۔ البتہ ہم باہر سے آنے والے کسی ایسے دستور و آئین کو قبول کرنے سے ضرور انکار کریں گے جو ہمارے اعتقادات و نظریات کے خلاف ہو، پھر ہمارے اپنے پاس ایسے اصول و قوانین ہوں کہ ہم باہر سے ملنے والے مستعار دستوروں سے بے نیاز ہو جائیں۔“

میں اخوان کو اس امر میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو ناپسند کریں، جنہوں نے انہیں سٹلیا، انہیں اڈیت دی، ان کے ایمان و جذبے کی توہین کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اخوان کے خلاف کارروائی میں عالمی استعمار کا ہاتھ تھا۔ وہ ان کی قوت کو کچل دینا چاہتا تھا۔ حکمرانوں سے اخوان کی یہ نفرت بالکل حق جانب تھی۔ اسی نفرت و ناپسندیدگی نے ان سیاسی اقلیتوں اور مصنوعی پارٹیوں کے خلاف سخت سیاسی موقف کی صورت اختیار کر لی جو ”فرد مسلط“ کی خدمت و خوشامد میں مصروف تھیں۔

میں بہ ہر حال، انتخابات میں جعل سازی و فریب کاری، آزادیوں کو دبانے اور جمہور عوام پر اپنی رائے کو مسلط کرنے کو کبیرہ گناہوں اور فواحش میں شمار کرتا ہوں۔ میں ان جرائم یعنی انتخابات میں دھوکہ دہی اور جعل سازی وغیرہ کو بد کاری، سود خواری اور بہت بڑی چوری بلکہ ڈاکہ زنی سمجھتا ہوں۔ ان انحرافات اور دھاندلیوں کے مقابلے میں جانب داری کو میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت قرار دیتا ہوں۔

استاد صالح عثمانی، الامام الشہید کے زمانے میں جماعت الاخوان کے وکیل تھے۔ انہوں نے امام حسن البنا کی شہادت کے بعد، اسلامی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے

لیے محلہ ”الظاہر“ میں واقع اپنے گھر میں ایک مرکز قائم کر لیا۔ پھر آپ نے ادھر ادھر سے بکھرے ہوئے اخوانیوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا، جلد ہی یہ عارضی مرکز، مستقل مرکز میں تبدیل ہو گیا یہاں منگل کے دن، درس ہونے لگے جیسا کہ استاذ البنا درس دیا کرتے تھے۔ اپنے مقاصد پر بحث و تمحیص کے لیے یہاں اخوان کے وکلاء بھی آتے۔ مصر کے جنوبی اور شمالی دونوں علاقوں کے قومی نمائندے بھی یہاں آنے لگے۔

ہم اس وقت سوچتے تھے کہ جماعت کے سیکرٹری..... جو اس وقت قائم مقام مرشد ہیں... کو یا جماعت کے کسی اور رکن کو، امام شہید کی جگہ نیا مرشد منتخب کیا جانا چاہیے۔

ان حالات میں اسلامی سرگرمیوں کا اجراء کوئی معمولی کام نہ تھا بلکہ بہت بڑی قربانی تھی بلکہ جان و مال کے لیے ایک بڑا خطرہ مول لینا تھا۔ اس لیے کہ شاہ فاروق اپنے تخت پر بیٹھا تھا اور اس کے بہت سے مخلص اس کے ساتھ تھے جیسے بولٹی، ادجار جلاو، کریم ثابت اور دوسرے بہت سے لوگ... جن کے نام اب میں بھول چکا ہوں۔

## حکومت کا ایک عجیب فیصلہ

میں جب قاہرہ واپس آیا تو مجھے ایک پیچیدہ معاشی مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے ان دنوں ”شہادت عالیہ“ کی ڈگری یافتہ حضرات کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کا قانون منظور کیا تھا۔ مگر اس کا اطلاق علماء مساجد پر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری تنخواہ صرف 5 گنی رہے گی جب کہ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ، کلرکوں اور دوسرے سرکاری ملازمین کی تنخواہ 12 گنی ہو گئی تھی۔

## اوقاف کا نظام تہس نہس

میں جب وزارتِ اوقاف میں ملازم ہوا تھا تو اس وقت یہ وزارت ریاستِ در ریاست تھی۔ یہ وزارت، مصارفِ صدقات میں خرچ کرتی تھی، خیرات اور فلاح و بہبود کے کاموں کی نگرانی کرتی تھی۔ قرآن شریف حفظ کرنے اور مساجد میں روحانی و تعلیمی سرگرمیوں کو منظم کرتی تھی۔ اپنے اخراجات پورا کرنے کے لیے وزارتِ اوقاف ہزاروں ایکڑ زمین کاشت کرتی تھی۔ کاشت کاروں کو ان کی اجرت ادا کرتی تھی۔ سینکڑوں گھر تعمیر کرتی تھی۔ بلکہ زرعی صنعت کے کچھ کام بھی کر رہی تھی۔ حقیقت میں وزارتِ اوقاف، وزارتِ زراعت و بہبودِ عامہ بن چکی تھی۔ بلدیات، تعلیم و ثقافت، صحت و تعمیرات کے سب کام اسلامی تہ و احسان کے مختلف شعبوں کی صورت میں ہو رہے تھے۔

مگر اب جب میں نے وزارتِ اوقاف کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُسے تباہ کرنے یا اس کے دائرہ کار کو بالکل محدود کرنے کا منصوبہ مکمل ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے وزارتِ اوقاف سے، اُس کے سب اسلامی ہسپتال واپس لے لیے گئے اور ان کا الحاق وزارتِ صحت سے کر دیا گیا۔

زمانے کا انقلاب دیکھئے کہ خازن دارہ جمعی ایک نیک خاتون، اپنی تمام جائیداد مسجد، پناہ گاہ اور ہسپتال تعمیر کرنے کے لیے، محض اللہ کی رضا کی خاطر وقف کر دیتی ہے۔ مگر فوجی انقلاب آتا ہے تو وہ اس وقف کردہ ہسپتال کو.... جو مسلمانوں کے لئے مختص ہے.... لینے اور اُسے عام کر دینے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے بعد وہ پناہ گاہ کو لے لیتا ہے۔ پھر وہ عوامی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردہ تمام املاک، جائیداد اور اراضی پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

افسوس کہ وزارتِ اوقاف سے اس کے تمام ہسپتال چھین لیے گئے۔ اس کے



شعبہ صحت کو بند کر دیا گیا۔ اب وزارتِ مذہبی کا ”قلاوون ہسپتال“، ”مستشفى الملك“ اور خیراتی ادارے محمد علی، نیز جمعیتہ خیریتہ اسلامیہ کے ہسپتال بلکہ قاہرہ شہر اور تمام صوبوں میں واقع ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں سے اس کا تعلق ختم ہو گیا۔

اصولاً ہسپتال ہر مریض کا استقبال کرتے ہیں خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہسپتال کی مذہبی چھاپ کو محض اس لیے ختم کر دیا جائے کہ اس کا تعلق دینی اسلام سے ہے۔ جمعیاتِ الشباب السخیہ (کرسچن سوسائٹیز فار ایگ) میں مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ان سوسائٹیوں کی مسیحی نسبت کو ختم کر دیا جائے۔

مصری اور غیر مصری سب مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ اُن کے اپنے ہسپتال ہوں جن پر خاص اسلامی چھاپ ہو۔ اور اس وقت تو یہ حق اور زیادہ ہو جاتا ہے جب یہ ہسپتال مسلمانوں کے خاص اموال سے چلائے جا رہے ہوں اور حکومت کی مدد سے بے نیاز ہوں۔ اب عجوزہ کے مقام پر الجمعیۃ الاسلامیہ انجمن کے ہسپتال میں، مسیحی راہبات رہ رہی ہیں جہاں پر وہ اپنی عبادات و رسوم چالاتی ہیں حالانکہ یہ خیراتی اسلامی انجمن کا ہسپتال ہے۔ ہاں افسوس کہ درخت پر بننے والی بلبلوں کے لیے تو چچھمانے پر بھی پابندی اور دوسرے ہر طرح کے پرندوں کے لئے مکمل آزادی۔

## نت نئی بُری خبریں

فوجی انقلاب آنے کے بعد، اب تو ہر روز الم ناک خبر سننے کو ملتی۔ انقلابی کونسل نے فرمان جاری کیا کہ وزارتِ اوقاف اپنی تمام زرعی اراضی اور جائیداد، وزارتِ اصلاح زرعی اور مقامی انتظامیہ کو سونپ دے۔

انہی دنوں فوجی انقلابی کونسل کے ان احکام پر عمل کرنے والے ایک آفسر

میرے پاس آئے وہ کہنے لگے کہ خیراتی وقف، مصر میں سب سے بڑا جاگیر دار ہے۔ میں نے ان سے کہا: کیا ایسے شخص کو جاگیر دار کہا جاسکتا ہے جس نے اپنی ساری ملکیت لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھی ہو۔ یہ سب اموال اللہ کے لیے ہیں۔ اصل سرمایہ تو محفوظ ہے جب کہ اس کی پیدوار کو اسلام اور امت اسلامیہ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے۔ لہذا آپ ان پر کیسے قبضہ کر سکتے ہیں؟

سچ تو یہ ہے کہ یہ غضب، مصر کی تاریخ کا سب سے بڑا ظلم و استبداد ہے۔ یہ تاریخ مصر کی سب سے بڑی تباہی و حق تلفی ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ غصہ پی کر خاموش ہو رہا۔ پھر ایک اور خبر آئی کہ جماعت اخوان المسلمون پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اس کا سرمایہ ضبط کر لیا گیا ہے اور اس کے ارکان کی بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ مجھے اخوان نے، اپنے فیصلہ کے مطابق جماعت سے الگ کر دیا تھا اور ان کے اس اقدام سے ہر کوئی واقف تھا مگر جب اخوان پر مصیبت آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اسلام کے حاضر و مستقبل کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہوائے تند و تیز چل پڑی ہے۔ میں دور کھڑا کچھ ہی سکتا تھا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

## فوجی ٹولے کا ظلم و جبر

”فوجی عدالت“ نے اخوان کے چھ افراد کو سزائے موت دی۔ ان میں استاد عبدالقادر عودہ، شیخ محمد فرغلی وغیرہ جیسے عظیم حضرات تھے۔ (اخوان کے مرشد عام شیخ حسن السہضیبی) نائب مرشد عام عبدالقادر عودہ اور اخوان کے دیگر چار راہ نماؤں شیخ محمد فرغلی، یوسف طلعت، ابو ایہم طیب اور ہندادی دوبر کو 7 دسمبر 1954ء کے روز موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں سے مرشد عام کی سزا کو تو جس دوام میں تبدیل کر دیا گیا لیکن دوسرے حضرات کو 8 دسمبر 1954ء کی صبح کو آدھ آدھ گھنٹے کے وقفے سے قاہرہ کے جیل

خانے میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ حاشیہ از۔ محمد ظہیر الدین بھٹلی) ”فوجی عدالت“ کے اس فیصلے پر میں نے اپنے ہم نغیوں سے کہا کہ میں آپ حضرات سے شخصی آمریت کی قباحتوں اور ایک موقر آئین کے نہ ہونے کی خرابیاں بیان کرتا رہا۔ شاہ فاروق نے جب حسن البنا کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو رات کی تاریکی میں انہیں ختم کرنے کی سازش کی۔ عوام پر شاہ فاروق کا یہ جرم مخفی نہ رہا۔ اگرچہ شہید مرحوم کے اصل قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ مگر آج فوجی افسروں پر مشتمل ایک کمیٹی دن دہاڑے چھ صالح ترین مسلمانوں کو قتل کر دیتی ہے مگر کسی میں اس اقدام پر اعتراض کرنے کی جرات نہیں ہے۔ خوف و رعب نے زبانوں کو گنگ کر دیا ہے۔ اب کہاں ہیں وہ لوگ جو وزیر اعظم نچاش پاشا پر گندے انڈے پھینکتے تھے۔ استاد عقاد نے شاہ فاروق کے سامنے اُن پر تیز و تند تنقیدی حملہ کیا مگر اس کے باوجود وہ صرف چند ماہ جیل میں رہے، جہاں انہوں نے جرمن زبان سیکھی۔ میں جب آزادیوں کی حمایت کرتا تھا تو آپ لوگ میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اب آپ کو پتہ چل گیا نا کہ آزادیوں کی کتنی قدر و قیمت ہے۔

مجھے ایک عرصہ یاد آرہی ہے جو اخوان المسلمون کے جنرل ہیڈ کوارٹر میں ہوئی۔ میں اس وقت جماعت کارکن تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم 1923ء کے دستور کو کالعدم کرنے کے حق میں فیصلہ دیں۔ استاد عبدالقادر نے دیکھا کہ اس فیصلے کے بارے میں کچھ لوگ متردد ہیں۔ ایک صاحب نے اُن سے کہا۔ دستور کی عدم موجودگی میں، کاروبار حکومت کیسے چلے گا؟ اور ہم پر حکومت کون کرے گا؟ استاد عودہ نے حیران سا ہو کر کہا۔ ”ہم پر کس طرح حکومت کی جائے گی۔“ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ ”اخوان! تم ہی حکومت کرو گے۔ تمہاری حکومت جلد قائم ہونے والی ہے۔“

میں اور استاد عبدالقادر عودہ دونوں گھرے دوست رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم دونوں میں سے زیادہ سادہ لوح کون ہے؟ ہم دونوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ہم

میدان سیاست کے لئے ناموزوں ہیں۔

وہ واحد شخص، جس نے اخوان میں سے اس قرارداد کی مخالفت کی اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ تھے استاد احمد عبدالعزیز جلال... انہیں بھی میرے ساتھ ہی اخوان سے الگ کر دیا گیا... اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے... وہ ہم سب میں سے زیادہ بالغ نظر تھے۔

## جب انور السادات نے جمعہ پڑھایا

آئیے واپس اپنی وزارت کی طرف چلیں جو سمٹ اور سکڑ رہی تھی۔ ڈائریکٹر مساجد کی اسامی خالی تھی میں عارضی طور پر یہ ذمہ داری ادا کر رہا تھا تاکہ جب تک اس منصب پر کسی شخص کا باقاعدہ تقرر نہ ہو جائے میں یہ ذمہ داری نبھاتا ہوں۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک روز ہمیں اطلاع ملی کہ کرمل انور السادات آئندہ جمعہ کے روز ایک مقامی مسجد کا افتتاح کریں گے اس لیے آپ لوگ تیار ہو جائیں۔

میں اور برادر شیخ سید سابق مسجد پہنچے، وہاں جا کر پتہ چلا کہ جمعہ کا خطبہ خود السادات دیں گے۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی اس لیے کہ یہ مسجد الجمعۃ الشرعیۃ کی تھی اور لوگ خطیب کو ایک خاص وضع قطع میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مسٹر انور السادات عرفی عازیب تن کیے تشریف لائے۔ ان کے سر پر عمامہ تھا جس کی ڈم نے ان کی گردن کے پچھلے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ اس ہیئت کدائی میں کسی قدیم انجمن کے رکن دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ان کا چہرہ غور سے دیکھا تو مجھے تعاشی یاد آئے (شیخ) نے یہاں عبداللہ التعاشی کی طرف اشارہ کیا ہے جو انگریزوں کے خلاف محمد احمد مہدی سوڈانی کی تحریک انقلاب کی کامیابی کے بعد اور خرطوم میں موجود برطانوی گورنر جنرل کو 1885ء میں قتل کرنے کے بعد مہدی کا جانشین بنا تھا۔ مہدی سوڈانی کے مشہور خلیفہ۔ سادات

جیسے شخص کا یہ دینی رُوپ دھارنا مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

انور السادات نے ملی جلی عربی زبان میں خطبہ دیا۔ کچھ تو لغۃ عامیہ تھی اور کچھ مسخ و خراب عربی۔ اُس نے خطبہ ختم کیا تو نماز کے لیے آگے بڑھا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ اس نے پہلی رکعت میں سورۃ الماعون پڑھی۔ گھبرا کر آیات آگے پیچھے کیں پھر کسی طرح یہ سورت ختم کر دی۔ دوسری رکعت میں خیر رہی۔ سلام پھیرنے کے بعد اُس نے ہمیں یوں دیکھا جیسے بہ زبان تنہم کہہ رہا ہو۔ تم لوگ کیا ہو؟ میرے ہوتے ہوئے تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟

اس سے پہلے میں اس شخص سے واقف تھا۔ میں نے اس کے بارے میں صرف اتنا سن رکھا تھا کہ جب یہ شخص کسی مشکل میں گرفتار تھا تو استاد حسن البنا، اس کے گھر کچھ امداد بھیجا کرتے تھے مگر اب... جیسا کہ میں نے محسوس کیا وہ کبر و جہالت کا مرتفع تھا۔

میں نے اپنے ایک دوست کے کان میں کہا۔ ”جہاں تک عبادت میں خطایا اس کی ادائیگی میں کمی کو تاہی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ معاف فرمادے گا مگر میں جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ قوم کے شہری اور فوجی معاملات کو جہالت و اذعانیت کے ساتھ چلایا جائے۔“

میرا سن چاہتا تھا کہ میں انور السادات سے کہوں۔ ”آپ علماء کو نماز پڑھاتے ہیں حالانکہ آپ نہ ٹھیک طرح سے خطبہ دے سکتے ہیں نہ لامت کر سکتے ہیں۔“ مگر میں چپ رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اخوان سے الگ کیے جانے کے بعد، محکمہ اوقاف سے بھی نکال دیا جائے۔

## اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار

اس حقیر ذراے کو بھول کر آئیے ہم اس سے کچھ سبق حاصل کریں۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ فکر و ضمیر کی پرداخت کرتا ہے۔ بدن کو صاف، صفوں کو متحد اور انسانی تعلقات کو محبت و اخوت کے رنگ میں رنگتا ہے۔

میرے دوست شیخ محمد سائق اور میں نے، عوام کو مسجد سے مربوط کرنے اور مسجد کی تعلیمی و ثقافتی کارکردگی کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کافی کوشش کی۔ ہم نے جن تجاویز پر عمل کیا ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہر مسجد کے ساتھ ایک مقامی انجمن تشکیل دی جائے تاکہ یہ انجمن، امام کے ساتھ، اس کے مادی و روحانی فرائض انجام دینے میں تعاون کرے۔ ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہم اخوان المسلمون کو از سر نو بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ”انجمن“ کا لفظ ختم کر دیا اور ”مجلس المسجد“ کا نام اختیار کیا جیسے کہ وزارت تربیت و تعلیم کے اسکولوں میں مجلس کباء (Parents Comeitee) تشکیل دی گئی ہیں۔ اسی طرح ہم نے کچھ پروگرام بنائے۔ کچھ کتابیں تیار کیں تاکہ ائمہ مساجد ان کی مدد سے پورا ہفتہ درس دے سکیں۔ ہم نے یاد کرنے کے لیے کاپیاں تیار کیں جن پر زیر درس و تعلیم مواد اور خطبے و تقریر کا مسودہ لکھا جاتا۔

ہماری کوششوں کے علی الرغم حالات دوسری طرف جارہے تھے۔ اس کا واضح اظہار اس وقت ہوا جب مسٹر حسین الشافعی نے وزارت امور دینی کی کمان سنبھالی۔ میں جہاں تک انہیں جانتا ہوں وہ ایک پاک دل و پاک باز مرد مسلمان تھے۔ دین سے محبت رکھنے والے۔ ان کے ہاتھ پاک اور ان کی زبان پاکیزہ تھی۔ مگر اس وقت وہ جمال عبدالناصر کے زبردست حامی اور اس کے انقلاب کے موید تھے۔ مسٹر شافعی نے ایک عجیب نظریہ پیش کیا کہ ملک کی تمام مساجد کو قومی کمیٹیوں کے حوالے کر دیا جائے وہی ان کا انتظام کریں اور وہی ان

کے بارے میں جواب دہ ہوں۔ ان قومی کمیٹیوں کو وزارتِ دینی امور کافی امداد دے جب کہ یہ کمیٹیاں وزارتِ سماجی امور کے ماتحت ہوں۔

میں نے پوچھا۔ یہ کیوں؟

کہا گیا۔ یہ بھر ہے۔

میں نے پوچھا۔ کیا یہ طرزِ عمل، وزارتِ تعلیم کے تحت چلنے والے سرکاری اسکولوں کے ساتھ بھی اختیار کیا جائے گا؟

جواب ملا: نہیں۔

میں سمجھ گیا کہ اصل مقصد مملکت کو سیکولر بنانا ہے جس کا مذہب سے براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے درِ عمل میں، ہم نے پورے ملک کی سطح پر، مساجد میں ایک زبردست تحریک چلائی۔ اہرام کے نمائندے استاد محمود الکولی نے میرا انٹرویو لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یوگو سلاویہ، میں اس نظام پر عمل ہو رہا ہے... مساجد کو قومی کمیٹیوں کی تحویل میں دینے کے خلاف، اتحادِ ائمہ نے اسکندریہ سے ایک زبردست بیان جاری کیا۔ اللہ کا کرم ہوا کہ یہ تجویز فائل ہی میں رہ گئی اور اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ہم ان اسباب سے ناواقف رہے جن کی وجہ سے یہ تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ مصر میں، ”ناصری انقلاب“ لانے والے اسی قماش کے لوگ تھے جس قسم کے لوگ ترکی میں ”محمالی انقلاب“ لانے والے تھے۔ فرق صرف عنوان اور اسلوب کا تھا۔ ناصری انقلاب لانے والوں نے مصر کے حالات اور مصری قوم کے مزاج کو سامنے رکھا تھا۔

میں نے اپنی کتاب ”کفاحِ دین“ میں بتایا ہے کہ پائلٹ عبداللطیف بغدادی نے ”قاہرہ کو خوب صورت بنانے کے آپریشن“ میں تقریباً بیس مسجدیں مسمار کر دی تھیں۔

سوال یہ ہے کہ مساجد کی جگہ اگر یہودی عبادت گاہیں ہوتیں تو کیا انہیں بھی

مندم کیا جاتا؟ یہ دین اسلام کے خلاف سازش ہے۔ اسلام کے پاس بان خواب غفلت میں پڑے ہیں۔

## میرے عزائم اور ماحول

میں نے دعوت کے کام کے لئے، اپنے آپ کو مختص کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ میں اپنی مرضی و فضا اور اپنے من پسند طریقہ کے مطابق کام کروں۔ میرے سامنے دو میدان تھے۔ تالیف اور مساجد کے میدان۔ مجھے تالیف کے میدان میں اللہ تعالیٰ نے قبولیت و ہر دل عزیزی سے نوازا تھا۔ مساجد کے میدان میں بھی مجھے کام کرنے کا تجربہ اور ملکہ حاصل تھا۔ میں درس و خطبے دینے اور ہزاروں ائمہ مساجد کو مثالی نبی اور صحت مند انہ مقاصد و غایات کی طرف راہ نمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

مگر میرے راستے میں رکاوٹیں بہت تھیں۔ اسلام کی صحیح خدمت کرنے والوں کو اگر کسی الزام کے تحت جیل میں نہ بھی ڈالا جائے تو بھی اسے مختلف تہمتوں اور الزامات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مذہبی ماحول بھی داعیانِ دین کے بارے میں سخت موقف اختیار کرتے ہیں۔ وہ دعوتِ دین کا فریضہ انجام دینے والوں کو مجبوراً ہی برداشت کرتے ہیں۔ جامع ازہر اور وزارتِ اوقاف سب کا یہی حال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نفرت کا سبب کچھ داعیوں کا طرزِ عمل بنا ہو۔ مگر طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس رکاوٹ کا اصل سبب ہے اسلام کو درست طریقے سے پیش نہ کرنا۔ نیز علماء کا اپنے آرام اور سہولت کی خاطر نصیحت کے مواقع سے دُور رہنے کو ترجیح دینا، دنیا پرستوں پر دنیوی مفادات کا غلبہ اور زیادہ تر علماء میں علم کی کمی۔

داعی اور مبلغ لوگوں کے سامنے اپنے عقل و ادب کو رکھتا ہے، خلیفہ عبد الملک بن مردان سے کہا گیا کہ اے امیر المؤمنین! آپ بوڑھے ہو گئے؟ تو انہوں نے جواب



دیا۔ شبینی صعود المنابر وتوقع اللحن۔ ”مجھے منبروں پر چڑھنے اور نماز پڑھاتے ہوئے قراءت میں غلطی سرزد ہونے کے اندیشے نے بوڑھا کر دیا ہے۔“ اگر کسی کے پاس لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے علم نہیں ہے یا تقریر و خطاب کا سلیقہ نہیں ہے تو وہ منبر پر کیوں بیٹھتا ہے؟ ایسے شخص کو کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ یہ کتنا پھرے کہ خطامت و لامت تو معمولی کام ہے۔

## سرکاری ملازم کا احساسِ ذمہ داری

میں جب سے انتظامی مشینری میں شامل ہوا تھا میں نے اپنے آپ کو دفتری کام تک محدود نہیں رکھا تھا۔ میں مسجدوں، کلبوں اور کالجوں میں جاتا وہاں اسلام کے بارے میں گفتگو کرتا، اسلام پر تنقید و اعتراض کرنے والوں کے جواب دے کر اسلام کا دفاع کرتا، متلاشیانِ حقیقت کے لیے اسلام کی ٹھوسیاں پیش کرتا، میرے اس سارے عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ میری تعریف بھی ہوتی اور مذمت بھی... عزت بھی ہوتی اور توہین بھی کی جاتی۔

میں پہلا بلا افسر تھا جو دفتر میں آنے کے فوراً بعد، اپنے سرکاری کام کا آغاز، قرآن کریم کا ایک پارہ پڑھنے سے کرتا۔ میں یہ پارہ ایک اچھے قاری کو سناتا۔ اس کے بعد میں تیار شدہ فائلوں کو دیکھتا اور لوگوں کے مسائل کا جائزہ لیتا۔ عوامی درخواستوں پر عمل درآمد کے لیے میں دسیوں دفاتر سے رابطہ قائم کرتا، کچھ مسائل میں خود حل کر لیتا اور کچھ کے لیے مجھے دوسرے دفاتر میں جانا پڑتا تاکہ وہاں سے مدد مل سکے۔ میرا حال بھی خلیفہ مامون الرشید کی طرح ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے بارے میں کہا تھا۔ حبيب الی فعل الخیر ، حتی طنت انی لا اوجر علیہ۔ ”مجھے بھلائی کے کام اتنے مرغوب خاطر ہیں کہ میں سوچتا ہوں مجھے ان پر اجر و ثواب نہیں ملے گا۔“

وزارتِ اوقاف کے دفترِ معلومات (انکوائری آفس) نے ایک جائزہ لیا تو معلوم ہوا

کہ وزارت کے دفاتر میں آنے والوں میں تین چوتھائی، مجھے ملنے آتے ہیں۔ جب مجھے بتایا گیا تو میں نے کہا۔ پبلک سرونٹ (خادم عوام) کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ... زبانی نہیں بلکہ.... حقیقتاً عوام کا خادم ہو۔ عوام کی خدمت میں کوتاہی کرنے والے حرام کھاتے ہیں۔ میں اخوان المسلمون کے لوگوں کی انفرادی طور پر، بڑھ چڑھ کر مدد کرتا تھا۔ جہاں تک میرے بس میں ہوتا میں ان کی بھرپور مدد کرتا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرتا۔

## اخوان المسلمون پر ظلم و تعہد اور دنیا دار علماء کا طرزِ عمل

جب مجھے اخوان المسلمون سے نکالا گیا تو میں نے ان پر اور انہوں نے مجھ پر تنقید کی۔ دونوں طرف سے ہونے والی اس باہمی زیادتی کا، جماعت کے مستقبل پر ناگوار اثر پڑا۔ اس زیادتی پر اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے۔

حکومت نے جب دوسری مرتبہ اخوان پر پابندی لگائی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا فائدہ یہودیت و نصرانیت کو ہی ہوگا۔ میں غم کے گھونٹ بھر کے رہ گیا۔ اذیت رسانی اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا تو میری تمام تر ہمدردیاں کم زوروں اور مظلوموں کے ساتھ تھیں۔ ان کو درپیش تکالیف اور ان پر روا رکھے جانے والے ظلم و تعہد پر میں بہت رویہ رونے کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا؟

اس المیہ کا بیان کرنا ضروری ہے کہ اخوان پر یہ کاری ضرب در حقیقت اسلام پر حملہ تھا۔ اگر دین کے نام پر ایک آدھ شخص کو اس کی غلطی کی سزا دی جاتی تو ہم کہتے کہ عدل اپنا راستہ خود ہی بنالے گا مگر اسلامی تعلیمات کو مٹانا اور کتاب و سنت کے نصف سے زائد حصے کو

معطل کر دینا، محض اس بنا پر کہ کسی جماعت نے کوئی غلطی کی ہے تو یہ عجیب بات ہے۔  
 صدر مملکت کا مصطفیٰ کمال جیسے مرتد شخص کی تعریف کرنے کا کیا مطلب ہے؟  
 اس کی یاد میں ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کا حکم صادر کرنا اور اسے یاد کرنے کا کیا مطلب جس نے  
 ریاست سے دین کو الگ کر دیا اور حکومت کو سیکولر کر دیا، اسلام پر حملہ کرنے والے، اس کا  
 پرچم گرانے اور خلافت کو ختم کرنے والے شخص کے یادگاری ٹکٹ کیوں؟

محکمہ اطلاعات میں کام کرنے والے میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ ہم نے  
 فلاں مولانا صاحب کو بلوایا تاکہ وہ خان دانی منصوبہ بندی کے بارے میں ہمیں کچھ احادیث لکھ  
 دیں۔ حضرت شیخ نے دریافت کیا۔ ”آپ لوگ خان دانی منصوبہ بندی کے جائز ہونے پر مجھ  
 سے احادیث لکھوانا چاہتے ہیں یا حرام ہونے پر؟“ اس پر محققہ افسر نے ازراہ مذاق کہا۔ پانچ  
 احادیث اس کے حلال ہونے کے حق میں لکھ دیجئے اور پانچ حدیثیں اس کے حرام ہونے کے  
 حق میں۔

میں (شیخ محمد الغزالی) نے کہا: یہ مولانا صاحب تو جمہوریہ عربیہ مصر کے مفتی  
 ہونے کے اہل ہیں یا پھر وزیرِ اوقاف بننے کے لائق ہیں۔  
 میرا وہ دوست کہنے لگے۔ یا پھر شیخ الازہر ہونے چاہئیں؟  
 میں نے تھوڑے ترّد کے بعد کہا: جی ہاں۔ بالکل۔ شیخ الازہر کا منصب ان کے  
 لیے موزوں ہے۔

ان تینوں حضرات (مفتی جمہوریہ، وزیرِ اوقاف، شیخ الازہر) نے فوجی حکومت  
 کے زمانے میں، اسلام کے بارے میں وہ کچھ کہا، جس کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔  
 اس قسم کے حضرات نے نہ صرف مصر میں بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں، کچھ  
 خواتین و حضرات کی خواہشات کی تسکین کی خاطر، فقہ میں من مانی تاویلات کیں اور ایسے  
 احکام گھڑے جن کی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی۔ ان لوگوں کو اللہ کے غضب، اُس کے

مردوں کی نفرت اور عوام کی حقارت کے سوا کچھ نہ ملا۔ اُن کے بارے میں احمد محرم کہتا ہے۔  
 اری علماء الدین لا یحفظونہ..... ولا یرفعون الیوم رایتہ العلیا  
 ہم اتخذوا ما احرزوا من علومہ... مسیلاً الی ما یتغنون من الدنیا  
 اذا ما اتاہم جاہل بضلالۃ..... اتوہ بالقی عالم یحمل الفتیا  
 ترجمہ : میں دیکھتا ہوں کہ علماء دین، دین کی حفاظت نہیں کرتے اور نہ ہی اس  
 کے بلند پرچم کو اونچا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے حاصل کردہ علوم کو حصولِ دنیا کا ایک ذریعہ  
 بنا رکھا ہے۔ جب کوئی جاہل اپنی گمراہی ان کے پاس لاتا ہے تو دو ہزار علماء تائیدی فتوے لیے  
 اس کی جانب لپکتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں، یہودیت نے ہمارے خلاف اپنی مملکت قائم کی۔ صلیبی  
 قوتوں نے ہمارے ورثہ اور تشخص کے خاتمہ کے لیے ہمارے ملکوں پر قبضہ کیا۔ انہوں نے  
 مسلم ممالک میں ایسا نظام حکومت قائم کیا جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف اور اسلام کے برعکس  
 ہے۔ اس ظالمانہ نظام حکومت کے خلاف جب اہل ایمان کی غیرت ایمانی نے جوش مارا اور وہ  
 اپنے دین کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو انہیں کہا گیا کہ اگر حکمران اٹھتا ہے تو اس کا  
 شکریہ ادا کر دو اگر وہ برا ہے تو صبر سے کام لینا چاہیے۔ ہمارے لیے بھڑکی ہے کہ ہم الگ تھلگ  
 رہیں۔ خواہ کچھ بھی ہو تا رہے ہم کچھ بھی نہ کریں۔

کہاں گیا نصیحت کا فرض؟ امر و نہی کا فریضہ؟ کہاں ہیں جہاد کی مختلف اقسام؟  
 بدنی، مالی اور بیانی۔ کیا یہ سب کچھ جامع ازہر کے فارغ التحصیل علماء نے فراموش کر دیا۔ محض  
 ایک حکمران کی خاطر۔ ایسا حکمران جو اپنے کردار کے لحاظ سے بدترین ہے اور جس کی خیانت  
 کاری بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ایسے ظالم حکمران کے بارے میں ایک ازہری عالم کہتا  
 ہے۔ ”اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اُسے، اس مقام پر پہنچا دیتا کہ وہ جو کچھ کرتا رہے اُسے  
 پوچھنا نہ پاسکے۔“

مذہب کو اقوام کے لیے افیون قرار دینے والے لوگ، اسی قسم کے ”علماء“ کے اقوال سے تائید حاصل کرتے ہیں۔ میں غفوانِ شباب سے ہی اس خیانت کار قافلہ سے الگ تھلگ رہا ہوں، میں نے سمجھ لیا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری ہی زیادہ پائے دار ہے۔

## کتابوں پر پابندی

23 جولائی 1952ء کے فوجی انقلاب.... جو معین مقاصد کی خاطر برپا کیا گیا تھا... آنے کے تھوڑے عرصہ بعد، میں نے کئی کتابیں لکھیں۔ بعض کتابیں تو آسانی سے بازار میں آگئیں، البتہ میری دو کتابوں پر، وزارتِ داخلہ نے اعتراض کیا۔ پہلی کتاب تھی ”الاستعمار اتحاد و اطماع“... اور دوسری کتاب تھی ”کفارِ دین“۔

پہلی کتاب پر وزارتِ داخلہ کے اعتراض کا جواب میں نے دے دیا۔ چنانچہ یہ کتاب چھپتی رہی۔ دوسری کتاب کے بارے میں وزارتِ داخلہ نے فیصلہ کیا کہ وہ شائع نہیں ہو سکتی۔ معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ اب مجھے عدالت میں جا کر، اس موضوع پر بحث کرنا تھی۔ عدالت سے طلبی ہوئی۔ میں نے عدالت کی طرف جاتے ہوئے یہ بات محسوس کی کہ کتاب پر پابندی لگنا میرے لئے ایک نفسیاتی صدمہ ہے۔ یہ شدید اخلاقی و مالی خسارہ ہے۔ وزارتِ اوقاف میں، میری ملازمت کا معاملہ بھی شکوک و شبہات کی زد میں تھا۔ دشمن انتظار میں تھے۔ میں نے سوچا لوگ کہیں گے کہ اس نے اپنے دینی منصب کو، امن عامہ تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ میں عدالت کے روبرو پیش ہوا۔ صدرِ عدالت ایک پاک باز اور جرات مند شخص تھے۔

صدرِ عدالت: کیا آپ اس کتاب کفارِ دین کے مولف ہیں؟

میں: جی ہاں۔

صدرِ عدالت: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کے کچھ ابواب اشتعال انگیز ہیں؟  
میں: بھتر ہو گا کہ فاضل عدالت اس الزام کی تصدیق کرے۔ جو کچھ میں نے دلائل و شواہد کے ساتھ لکھا ہے اگر وہ درست ہو تو پھر مجھے ہدفِ ملامت منہ نہ بنایا جائے۔

صدرِ عدالت: ایک بات درست ہو سکتی ہے لیکن ہر معلوم بات کا کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات، اس کے تذکرہ سے دلوں میں ہیجان اور اشتعال پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ہمیں سکون کی ضرورت ہے۔

میں: میں نے ان مساجد کا تذکرہ کیا ہے جو صرف قاہرہ شہر میں مسمار کی گئی ہیں تاکہ اللہ کے گھروں کی اس عملاً بادی کو روکا جاسکے۔ میں نے لکھا ہے کہ صرف ”جدید مصر“ میں 34 گرجے اور صرف سات مسجدیں ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی لبادی بہت زیادہ ہے اور قطبی، مسلمانوں کی کل تعداد کے دسویں حصے سے بھی کم ہیں۔ کیا میں نے ان اعداد و شمار کو بیان کر کے کوئی غلطی کی ہے؟ میں نے یہ معلومات بلدیہ قاہرہ کی 1957ء کے نشریہ سے لی ہیں۔

صدرِ عدالت: میں آپ کے بیان کردہ اعداد و شمار کو غلط نہیں ٹھہرا سکتا مگر اصل خطرہ ان کو پیش کرنے کے طریقے میں ہے جس سے ہیجان و تشویش پیدا ہوتی ہے۔

میں: جناب جج! ایک شخص راستے پر جا رہا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ایک چور دوکان کا دروازہ توڑ کر دوکان میں چوری کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اگر میں نے اسے روکا تو ہو سکتا ہے چور مجھے کچھ نقصان پہنچائے، چنانچہ وہ اسے اس حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لیتا ہے۔ اس شخص کو اس کی بددلی پر معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر چور کو چھوڑ کر بھاگنے والا پولیس کا سپاہی ہو تو اسے یقیناً خیانت کا ر سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ امن و حفاظت حال کرنا اس کا فرض ہے۔

صدرِ عدالت: یہ درست ہے۔

میں: میں اپنے سرکاری منصب کے لحاظ سے ایمان کا محافظ ہوں۔ میں اگر مساجد کے منہدم

کیے جانے یا مساجد کی جگہ دوسری عمارات تعمیر کیے جانے پر چپ رہتا ہوں تو میں خیانت کار سمجھا جاؤں گا۔

میں نے محسوس کیا کہ فاضل جج یعنی صدر عدالت کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا اور وہ ایک گہری لور بنجیدہ سوچ میں ڈوب گئے۔ اب ان کے چہرے پر خوفِ خدا کی علامات واضح تھیں۔ وہ قدرے سکون و محبت کے ساتھ میرے ساتھ بحث کرنے لگے۔ وہ کتاب کے صفحے الٹ رہے تھے اور مجھ سے کچھ علمی حقائق کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ پھر انہوں نے کتاب پر پابندی نہ لگانے کا حکم صادر کر دیا اور کتاب کی آزادانہ خرید و فروخت کی اجازت دے دی۔

میں اس فیصلے پر شادواں و فرحان، عدالت سے نکلا۔ عدالت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پولیس والے مجھ سے نہایت سرد مہری سے ملے، گویا وہ میرا تسمخہ اڑا رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ عدلیہ کا فیصلہ، وزارت داخلہ کے احکام پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ عدلیہ ایک شخص کو دی کر دیتی ہے مگر وزارت داخلہ، اپنے مقاصد کے لیے اسے پھر گرفتار کر لیتی ہے۔

عدلیہ کے اس فیصلے کے باوجود، کتاب پر پابندی برقرار رہی۔ جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد ہی یہ پابندی ختم ہوئی کیوں نہ ہو مرحوم ”حریت و آزادی کے چیمپئن“ اور ”بڑے وسیع القلب“ صدر تھے۔

## میرا طریق دعوت

میں اب اپنے طریقہ دعوت پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں نیز یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ایمان کو مستحکم کرنے کے میرے ذرائع کیا تھے اور میرا اسلامی منہاج کیا ہے؟

میرا عقیدہ ہے کہ دین ہی فطرتِ سلیمہ ہے۔ دین کا حلیہ بعد میں، بری رسوم اور سقیم افکار سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے نصب العین میں، سلامتی فکر کے لحاظ سے بہت

فرق ہوتا ہے۔ میں تو یہ دیکھا کرتا ہوں کہ لوگوں کے اقوال و افعال کیا ہیں۔ پھر میں انہیں اس معیارِ فطرت پر پرکھتا ہوں، جو میں نے مقرر کر رکھا ہے۔ اگر وہ خیر ہو تو میں اسے تسلیم کر لیتا ہوں اور اگر شر ہو تو انکار کر دیتا ہوں۔ تسلیم و انکار دونوں صورتوں میں، میں اُس ورثہ سے، لوگوں کی کمی و کوتاہی کی تکمیل کرتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت کیا ہے۔ یعنی میں ان کی علمی و ذہنی سطح کو جاننے کے بعد، دینِ اسلام کی تعلیمات سے انہیں آگاہ کرتا ہوں۔ دین، لائقِ تکریم ہے، اللہ نے مجھے دینِ اسلام سے سرفراز فرمایا ہے تو مجھے اس کی قدر کرنا چاہیے۔ اس کی قدر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ میں اسے اُن لوگوں تک پہنچاؤں... جو اپنے حالات کی وجہ سے... اس نعمتِ علم و دین سے محروم رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں سختی اور دوسروں پر نقد و کتہ کے خلاف ہوں۔ جس طرح میں دوسروں کے دین و مذہب پر حملہ کرنا پسند نہیں کرتا، اسی طرح میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص میرے دین پر حملہ کرے اور مجھ پر اپنی رائے مسلط کرے۔

یہی وجہ ہے کہ میں کسی بھی معاشرے اور کسی بھی حلقے میں دعوتِ دین کا کام کرنے سے نہیں گھبراتا۔ نہ ہی میں بڑے بڑے ناموں اور مختلف سماجی و معاشی گروہوں اور طبقوں کے مختلف عنوانات سے مرعوب ہوتا ہوں۔ میں تو اس نقطہٴ اتصال کی تلاش میں ہوتا ہوں جس تک میں، وحی کی روشنی میں پہنچتا ہوں اور دوسرے لوگ تجربہ، فلسفہ یا علم کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ میں اس نقطہٴ اتصال سے ہی اپنے دین کے لئے کام کا آغاز کرتا ہوں۔ نہایت اعتماد و سکون کے ساتھ۔

بہت سے علماء کرام، مثلاً جمہوریت اور اشتراکیت کے لفظوں سے بدکتے ہیں۔ مگر میں الفاظ کے ظاہر سے متفرغ نہیں ہوتا۔ سیاسی استبداد اور سرمایہ دارانہ نظام کی حرص و طمع سے ہر کوئی فطری طور پر نفرت کرتا ہے۔ میں سیاسی استبداد اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کے مقابلے میں اسلامی نظام کی خوبیاں اور لہجائیاں میان کرتا ہوں۔ جب میں



حقیقتِ اسلامیہ کو پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا.... میرا کام یاب ہونا ضروری تھا ورنہ میں ایک ناکام داعی ہوتا.... تو میں جس فرد سے گفتگو کر رہا ہوتا یا جس طبقہ سے مخاطب ہوتا، میں انہیں عقیدہ، عبادت اور ایمان کے جملہ اجزاء کا وسیع تر تعارف کرواتا اور انہیں اسلام کے آفاقی پہلوؤں سے آگاہ کرتا۔

## میدانِ عربہ میں

اپنے اسی طریقہ تبلیغ کے تحت میں، میدانِ ”عربہ“ میں جا گھسا۔ میں نے عرب ازم کے حامیوں سے کہا۔ آپ لوگ عربی انقلاب چاہتے ہیں؟ میں بھی عربی انقلاب چاہتا ہوں۔ کیا حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر، کسی نے عربوں کی شانِ بلند کی ہے؟ عربوں کی زبان کو اگر وہ ام خطا ہے تو قرآن کریم نے؟ عربوں کو تاریخ میں داخل کیا ہے تو صرف اسلام نے؟ عربوں کی عسیتوں کا خاتمہ اور ان کے غیض و غضب اور دشمنی و عداوت کو اگر جڑ سے اکھاڑا ہے تو صرف اس دہلیا اسلام نے.. اسلام نے عربوں کا پرچم بلند کیا، ان کے دشمنوں پر انہیں غلبہ دیا ہے۔ انہیں ایک دائمی ولدی مشن سونپا ہے۔ عربوں کا یہ دائمی مشن، کل جہانوں کے لیے رحمت ہے۔ اگر عرب، اسلام کو چھوڑ دیں تو ان کے پاس کون سا مشن رہ جاتا ہے جسے لے کر وہ آگے بڑھیں گے؟ آپ لوگ کہتے ہیں۔ لبدی مشن کی حامل متحدہ عرب قوم۔ اسلام کے سوا یہ کون سا مشن ہے؟

پھر اسلام نے تو عیسائی عربوں کو بھی عدل و خیر اور حسن سلوک کی ضمانت فراہم کی ہے۔ انہیں عزت و توقیر بخشی ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی عرب جو اپنی قوم کا احترام کرتا ہو، وہ حضرت محمد ﷺ سے نفرت کرے یا آپ ﷺ کی قوم کی بدخواہی کرے یا آپ ﷺ کے مشن کی توہین کرے۔

میں نے عرب ازم کے داعیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ

لوگ عربی زبان سے نفرت کرتے ہیں۔ عربی درشہ اور عربی تاریخ کو ناپسند کرتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں یقین ہو گیا ہے کہ یہ، خبیث استعمار کے ایجنٹ ہیں جو عرب ازم کے نام پر، خود عربوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

## مختلف قسم کے داعی

کچھ داعی حضرات جدید ناموں سے بدکتے ہیں۔ یہ لوگ جمہوریت یا اشتراکیت وغیرہ کے ناموں وغیرہ سے بہت گھبراتے ہیں۔ یہ داعی دو قسم کے ہیں۔

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے، جو مملوکی یا ترکی دور کی زبان میں مدون تعلیمات کے ڈھیر کو اسلام کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس سے سرموٹنے کے لیے تیار نہیں۔ موجودہ زمانہ کے کسی تقاضا کے تحت وہ اپنے اسلام کی کسی توفیق و وضاحت پر قطعاً گماہ نہیں۔ وہ مقاصد و اہداف کے حصول کی خاطر، ذرائع کے استعمال میں جدید تجویز اپنانے پر بھی تیار نہیں۔ اس قسم کے لوگ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی قرآن و سنت کے ارشادات کو صحیح سمجھ نہ سکنے کی وجہ سے... ایسی دور میں، گھوڑوں پر سوار ہو کر، جنگ کرنا چاہتا ہو۔ میں اس قماش کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ اور نہ ہی ان حضرات کی اس بے زاری یا اکتاہٹ کی کوئی پروا کرتا ہوں جو یہ مجھ سے رکھتے ہیں۔

داعی حضرات کی دوسری قسم، اسلام کے ظاہر و باطن کے بارے میں غیور ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ باہر سے آنے والے دل کش ناموں سے ان جلیل القدر حقائق کی بے قدری ہوتی ہے جن کے ہم وارث ہیں۔ ہمیں دوسروں کے دیئے ہوئے ناموں کو اپنانے کے بجائے دوسروں کے منصوبوں کو دیکھ کر، انہیں فطرت و وحی کی روشنی میں ڈھالنے کے بعد اپنانا چاہیے۔ ہمیں ان منصوبوں کو، چھاننی کے عمل سے گزارنے کے بعد، اپنے اعلیٰ اصولوں کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

داعی حضرات کی اس موخر الذکر قسم کے ساتھ میرا اختلاف... محض شکل و صورت میں رہ جاتا ہے۔ میں بھی انہی کی مانند حقیقتِ دینی اور غیرتِ قوی سے سرشار ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک سوراخ سے دودھ نہ ڈسانہ جاؤں۔ کتنے دین دار ہیں جن کے ذہنوں میں ”خلافت“ کا تصور جدید فرعونیت کا ہے کہ وہ بلاروک ٹوک من مانی کرتی رہے... یا... وہ ”خلافت“ سے مراد جدید قارونیت لیتے ہیں۔ جو دھڑا دھڑال و دولت جمع کرتی رہے اور اپنی اغراضِ فاسدہ کے لیے مال و دولت کو بلاروک ٹوک اڑاتی پھرتی رہے۔

## اشتراکی اتحاد میں شمولیت

ہم مسلمان ایک ایسے دین کے پیروکار ہیں جو واضح اور روشن ہے۔ میں مصر میں تھا تو میں نے ”اتحادِ اشتراکی“ میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ سوشلسٹوں میں رہ کر اسلام کی خدمت کروں گا اور دین کی دعوت دوں گا۔ میرے استاد حسن البنا فرمایا کرتے تھے۔ ”میں شیطان کے ساتھ بھی کام سے نہیں ڈرتا، ہم مل کر چلیں گے تو پھر معلوم ہو گا کہ کون کے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔“

میں نے بھی سوچا کہ سوشلسٹ تنظیم میں داخل ہوتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ اسلام کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں؟ شیخ حسن الدین میرے ساتھی تھے۔ وہ بیڑے خوش طبع اور زندہ دل شخص تھے۔ ہم جب حالات کے ستم سے گھبرا جاتے، تھک جاتے یا پریشان ہوتے تو ہم مل بیٹھتے تاکہ اس طرح ذرا غم ہلکا ہو جائے۔ اس موقع پر میری ان کے ساتھ خوب گپ شپ ہوتی۔ بعض اوقات گپ شپ سے اعصاب کو آرام ملتا ہے۔

میں اشتراکی اتحاد میں شامل ہو گیا۔ میری زندگی کا یہ ایک تلخ تجربہ تھا، جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی۔ ایک جیادی کمیٹی تھی جس کے ارکان کا انتخاب عوام کرتے تھے۔ ہر وزارت، ہر محلہ، ہر فیکٹری وغیرہ وغیرہ کی سطح پر۔ پھر ہر شعبے کی جیادی کمیٹیوں کے

نمائندے جمع ہو کر، مرکزی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب کرتے۔ پھر مراکز کی کمیٹیوں کے نمائندے مل کر ضلع کی کمیٹی چنتے۔ پھر ضلعوں کی کمیٹیاں مل کر سنٹرل کمیٹی کے مطلوبہ ارکان منتخب کرتیں۔ سنٹرل کمیٹی کے نصف ارکان میں سے لیجوٹیکو کمیٹی مقرر کی جاتی۔ یہ اعلیٰ کمیٹی ہی ایک طرح سے پوری مملکت کا انتظام و انصرام چلاتی۔ کیوں کہ اس کے کچھ ارکان وزیر ہوتے تھے یا وزیروں کے ماتحت۔

یہ بات سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں کہ یہ مرحلہ وار طویل چکر اس لیے تھا کہ چوٹی پر قابل اعتماد لوگ ہی پہنچ سکیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ تنظیم، کسی بھی اشتراکی ملک کی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کی طرح ہے۔ اس میں بنیاد چوٹی کا انتخاب نہیں کرتی بلکہ چوٹی بنیاد کی تشکیل کرتی ہے۔

میں مرکز میں ایسے لوگوں کو دیکھتا تھا جو ایک طرح سے غیر معروف قسم کے ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے، ”قدرت کی کاری گری“ سے ضلع کی سطح تک پہنچ جاتے تھے۔ پھر وہاں سے سنٹرل کمیٹی میں پہنچ جاتے کیوں کہ انہیں واضح طور پر اوپر سے مقرر کر لیا جاتا تھا۔

اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھئے کہ میں بھی ان تمام مراحل سے مرحلہ وار منتخب ہو کر بلند ہوتا گیا حتیٰ کہ سنٹرل کمیٹی میں جا پہنچا۔ مگر یہاں پہنچ کر، کر تا دھرتا لوگوں نے اپنے پسندیدہ ہندے رکھ لیے۔ مجھے ناقابل اعتماد ہونے کی بنیاد پر رد کر دیا گیا۔ میں نے دل میں کہا اگر یوں نہیں تو پھر یوں سی۔

میں نے اپنی جگہ کام شروع کر دیا۔ میں نے اپنے دین کی خدمت کا حلیہ کر لیا۔ فضا بہت ناگوار اور ماحول نہایت ناموزوں تھا۔ کمیونسٹ ملک مصر پر حکومت کرنے کے لیے صف بستہ ہو چکے تھے۔ جب کہ غیر کمیونسٹ، سرمایہ داروں کے دروازوں پر پڑے ان کی خوش آمد میں گن تھے۔ کچھ ایسے مفاد پرست تھے جو صرف اپنے مقاصد و مفادات کے لیے حرکت کر

رہے تھے۔

کیونستوں میں سے نمازی بہت کم تھے۔ اسلامی فکر، ان حلقوں میں اجنبی ہے اور اسلامی فکر پیش کرنا اور بھی عجیب ہے۔ ان لوگوں کے فیصلے پہلے اعلیٰ سطح پر ہو جاتے تھے پھر تائید و حمایت کے لیے نیچے سمجھ جاتے تھے۔

مجھے ان سوشلسٹوں کی ایک کانفرنس یاد آ رہی ہے۔ میں نے سنا کہ ایک صاحب شیخ پر کھڑے ہماری طرف سے یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم نے شخصی حالات کے قوانین کو تبدیل کرنا منظور کر لیا ہے۔ میں یہ سن کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ”یہ بالکل غلط ہے، ہم نے اس قسم کی کوئی چیز طے نہیں کی۔ یہ ایک من گھڑت بات ہے۔ یہ ایک بے جیاد چیز ہے۔ یہ ہم پر سراسر الزام ہے۔“

انتظامیہ کے پہرے دار فوراً میرے سر پر ان پہنچے وہ مجھے بٹھانے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ وہ مجھے پکڑ کر نیچے بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ اس صریح دھاندلی کے خلاف کوئی صاحب، میری تائید میں نہ اٹھے۔ اس پر میں نے چلا کر کہا۔ ”میں کانفرنس سے علیحدگی اختیار کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے گھر کی راہ لی۔

تاہم، میرے اس اقدام کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا۔ ”کمیٹی برائے خاندان“ کی از سر نو تشکیل ہوئی اور مجھے بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ ماضی اس وقت وکیل الا زھر تھے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس کمیٹی میں شامل تھے۔ آپ کچھ مدت تک، شر کو روکنے میں کامیاب رہے۔

صالحین میں سے ایک صاحب نے مجھے... اشتراکی اتحاد کی رکنیت قبول کرنے اور اس گھنیا ماحول میں کام کرنے پر.... ملامت کی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔ ”کیا ہم ہاتھ باندھے بیٹھے رہیں اور دوسرے لوگ فیصلے کرتے رہیں۔ ہم لا تعلق ہو کر، انہیں من مانی کرنے دیں۔ منفی طرز عمل تو کبھی سود مند نہیں ہوتا۔“ وہ کہنے لگے۔ ”آپ نے کیا کر لیا

ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میں تمنا کافی نہیں ہوں۔ ان عظیموں میں بڑی ہی سب سے اعلیٰ اخلاقی وصف ہے۔ میں جب کھڑا ہو کر مقرر پر اعتراض کر رہا تھا تو وزارتِ اوقاف کے سیکرٹری، میری دائیں جانب براجمان تھے۔ جب کہ میری بائیں طرف ازہر کے ایک بڑے شیخ تشریف فرما تھے۔ اعتراض میں کر رہا تھا اور گھبراہٹ دونوں رہے تھے۔ گویا یہ دونوں حضرات اُس بُرے وقت کو کوس رہے تھے جب وہ میرے پاس آکر بیٹھے تھے۔ یہ دونوں افراد جرات ایمانی سے قہمی داماں تھے۔ میں اس وقت سمجھا کہ حسن البنا کیوں ”درست دینی تربیت“ پر اس قدر زور دیا کرتے تھے۔“

میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ اس وقت میں، دعوتِ اسلامیہ کے میدان میں ایک ذمہ دار شخص تھا اور کئی سالوں سے جامع ازہر میں جمعہ پڑھا رہا تھا۔ میں نے اپنی کوشش بڑھانے اور مفید اسلامی عمل کے راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنے ساتھ عہد کیا کہ میں اپنی قوم کو اسلام سے قریب تر کرنے کے لیے، کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کروں گا اور اس مقصد کی خاطر جامع مگر تیز لانچ عمل اپناؤں گا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جلد ہی ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوگی تاکہ ”یثاقِ وطن“ پر نظر ثانی کرے اور اسے منظور کرے۔ آئندہ سالوں میں اسی ”یثاقِ وطن“ کی روشنی میں امورِ مملکت سرانجام دیئے جائیں گے۔

**نوٹ:** میں یہاں اپنی داستانِ حیات بیان کر رہا ہوں۔ مصر کو درپیش ہولناک حالات اور اہم واقعات کی تاریخ نہیں بیان کر رہا جب مصر پر اسرائیل، فرانس اور انگلستان نے حملہ کیا۔ نہ ہی میں مصر و شام کے مابین اتحاد کے آغاز و انجام پر گفتگو کر رہا ہوں۔ نہ ہی میں اخوان المسلمون کی جماعت پر گزرنے والی قید و بند کی صعوبتوں کو بیان کر رہا ہوں۔ نہ ہی میں مسلمانوں کے ثقافتی مرکز قاہرہ میں اسلامی وجود کو پارہ پارہ کرنے والے جھٹکوں کا ذکر

کروں گا۔ نہ ہی اس موقع پر یہ کہنا چاہوں گا کہ مصر نے، خدمتِ اسلام کے لیے جو تاریخی کردار ادا کیا وہ کردار ختم ہو چکا ہے۔

میں ان تمام واقعات سے ایسے گزر رہا ہوں جیسے ریل گاڑی کا مسافر، نشاناتِ راہ دیکھتا چلا جاتا ہے۔ ہاں میں کسی اندوہ ناک حالات یا کسی خاص واقعہ پر کچھ دیر کے لیے ضرور رک جادوں گا۔

.....  
خیر یہ بیوی کا نفرنس منعقد ہوئی۔ صدر عبدالناصر نے اس کا افتتاح کیا۔ مسٹر کمال الدین حسین، صدر کے معاون تھے اور اس کی غیر حاضری میں اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ مسٹر انور السادات، کانفرنس کے سیکرٹری جنرل تھے۔

ابتدائی کارروائی کے بعد ارکان نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر بیان کرنے کے لیے، اپنے اپنے نام لکھوانے شروع کیے۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے تقریر کرنے کی اجازت لی، میں اُن میں سے ایک تھا۔ میں نے اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا۔ ادھر ادھر کی باتوں، طول بیانی اور دھمکیوں سے احتراز کیا۔ میں نے کہا:

”برادرانِ محترم! ہم نے جو نعرہ بلند کیا ہے وہ ہے وطن اور اہل وطن کی آزادی کا نعرہ۔ کیا ہمارا یہ نصب العین اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ہم نے انگریز کو تو اپنی سرزمین سے نکال دیا مگر اس کے قوانین کو، اس کے طور طریقوں کو اور اس کی زبان و ثقافت کو باقی رہنے دیا۔ انگریزوں کے قانون، ان کے طریقے اور ان کی زبان نے ہمارے معاشرے پر قبضہ کیا ہے اور یہاں پر ان کی حکمرانی ہے۔ پھر اب جماد کس کے خلاف ہے؟ جدوجہد کس کی خاطر ہے؟ جب کہ ہمارا ظاہر فرنگیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور ہماری محبت ان کی باقیات سے قائم ہے۔“

مجی آزادی تو یہ ہے کہ ہم اپنے درخت کو زندہ کریں، یعنی اپنی زبان اور اپنے ادب کو۔

اؤلیت دیں۔ اپنی شریعت کو نافذ کریں۔ سامراج نے ہمارے لیے جو قوانین بنائے ہیں انہیں اٹھا کر پھینک دیں۔ استعمار نے ہمیں، ہمارے دین سے بے گانہ اور ہمیں ہماری تاریخ سے نا آشنا کرنے کے لیے جو قوانین وضع کئے ہیں ان کا قلاوہ اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔

ہمیں اپنے اجتماعی و معاشرتی مفادات کے تحفظ کے لیے نفع و نقصان کا موازنہ کرنا چاہیے۔ قتل کے ہزاروں مجرم سرزد ہوتے ہیں مگر سزائے موت چند ایک کو ہی ملتی ہے جب کہ زیادہ تر قاتلوں کو سزائے قید دی جاتی ہے۔ چند سال گزرنے کے بعد قاتل قیدی سزا بھگت کر اور قید کاٹ کر باہر آ جاتا ہے، ایک انسان اپنے والد یا بھائی کے قاتل کو یوں گھومتا پھرتا دیکھتا ہے تو وہ جوش انتقام میں اسے قتل کر دیتا ہے۔

کیا اس صورت حال کے ازالہ کے لیے کچھ واعظین کا تقرر کافی ہے کہ وہ لوگوں کو انتقام لینے کی عادت سے باز رکھنے کے لیے وعظ کرتے پھریں۔ قصاص کا قانون کیوں نافذ نہیں کیا جاتا؟ اس کے نفاذ میں کیا رکاوٹ ہے؟ قصاص جو اللہ نے زندگی کی حفاظت اور حصول انصاف کے لیے فرض کیا ہے۔ ہم اس قانون قصاص پر عمل کر کے اپنے رب کو راضی اور اپنے معاشرے کو محفوظ کر سکتے ہیں۔

اگر ایک بھوکا شخص اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے چوری کرتا ہے تو ایسے مجبور شخص کو قتل کرنے کے میں بھی خلاف ہوں۔ ایسے مجبور غریبوں کے ہاتھ کاٹنے کی شریعت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ مگر جب ہم ایسے شخص کو دیکھیں جو دوسری، تیسری اور چوتھی بار چوری کر رہا ہے خر مستی اور عیاشی کے لیے تو اسے ہم کیسے چھوڑ دیں؟ ہم حلال کی کمائی کرنے والوں کو ان مجرموں کی دست درازی سے کیوں نہ روکیں؟ ہم رزق حلال کمانے والوں کو چوروں، اچکوں اور لٹیروں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیں؟ ایک چور کا ہاتھ کاٹنے سے وہ سینکڑوں گردہ چوری سے رک جائیں گے جنہوں نے چوری کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔“



میں متروک و نظر انداز کردہ اسلامی حقائق کو بیان کرتا رہا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ معاشرہ ان حقائق کو اپنائے۔ پندرہ منٹ کے اس خطاب کے بعد میں نے تین منٹ سے بھی کم وقت میں ”لباس و پوشاک“ کے موضوع پر گفتگو کی۔ میں نے مطالبہ کیا کہ تمام مردوں کا لباس ایک جیسا ہو اور اسی طرح پورے ملک میں عورتوں بالخصوص طالبات کا لباس ایک جیسا ہو۔ میں نے اس کے ساتھ آسان شرائط رکھیں۔ یہ کہ کپڑا کم قیمتی ہو۔ ملکی پیداوار سے بنایا گیا ہو۔ یہی کپڑا صدر اور وزراء پہنیں۔ اسے ہر دفتر اور تقریب کا سرکاری لباس قرار دیا جائے۔ عورتوں کا لباس ایسا ہونا چاہیے جو چہرے اور ہاتھوں کے سوا پورے جسم کو ڈھانپنے والا ہو۔ میں نے تجویز کیا کہ اس مقصد کے لیے قریب ترین لباس، مسیحی راہبات یا مصری کسان عورتوں کا ہے۔

میں نے نہایت آسان زبان میں بات کی تاکہ ایک ہزار سے زائد منتخب افراد کا یہ مجمع آسانی سے بات سمجھ سکے۔ خطاب سے پہلے، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ میری رہنمائی فرمائے اور حاضرین کے دل میرے لیے کھول دے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ مسیح و عظیم نے میری دُعا قبول فرمائی۔ میری تقریر لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہوئی۔ اس کا پر تپاک خیر مقدم ہوا اور خوب تالیاں جائی گئیں۔۔۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگوں نے میری تقریر کو... اخوان المسلمون کی دعوت کی تشریح قرار دیا۔

ارکانِ کانفرنس میں سے سٹر کیونسٹ تھے اور وہ اسلامی فضا سے خوف زدہ تھے۔ وہ اس بات سے بھی سخت ناالاں تھے کہ بہت سے مندوبین اوقاتِ مقررہ پر نماز پڑھتے ہیں اور اسلام سے تمسک کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کمیونسٹوں نے میری سرگرمیوں کو روکنے کے لیے، میرے خلاف ایک ہنگامیز اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے مزاحیہ کارٹونسٹ صلاح جاہن کو اشارہ کیا کہ وہ ایک ایسا کارٹون بنائے جس سے میری ساری تقریر

بے اثر ہو کر رہ جائے۔

اگلے دن الاحرام کا اخبار آیا۔ جس میں میری تصویر ننگے سر بنی تھی۔ میرا عمامہ زمین پر گر پڑا تھا۔ یعنی سائنس کے قانونِ ثقل نے اسے کھینچ لیا تھا۔

مجھے یہ کارٹون دیکھ کر بے حد غصہ آیا۔ عمامہ کوئی میرا ہی مخصوص لباس نہیں ہے۔ یہ تو مسلم علماء کی پہچان ہے۔ کیونٹ کارٹونٹ نے گویا اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ سائنسی قوانین، اسلام کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا الاحرام کے چیف ایڈیٹر کا ”یثاقِ وطن“ کی تیاری میں بڑا کردار رہا ہے۔ اس یثاقِ وطن کا اسلام سے تعلق... خوف کا ہے یا اس کے راستے میں حائل ہونے کا۔

میں نے اپنے دل میں کہا۔ حملہ شروع ہو چکا ہے اور اس کا آغاز الاحرام سے ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان تقریروں کے اقتباسات بھی ہیں جو خود کانفرنس میں کچھ کیونسٹوں نے میری تردید میں کی تھیں۔

اگلے دن کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا تو میں نے وضاحت کے لیے وقت مانگا تاکہ جو مجھ پر الزامات و اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا جواب دے سکوں۔ مجھے تقریر کی دعوت دی گئی تو میں نے اپنے خطاب کو دو حصوں میں مکمل کیا۔

(اول) کیا ارکانِ کانفرنس کو آزادیِ تقریر ہے یا نہیں؟ کیا اخبارات کو ارکانِ کانفرنس کی آزادیِ گفتگو پر قدغن لگانے کا حق ہے؟ کہ وہ ارکان کی توہین کرتے پھریں۔ یہاں کے ہر رکن کو اپنی رائے پیش کرنے کا جو حق حاصل ہے، کیا یہ حق محفوظ ہے؟ یا انجوں ہی وہ بات کرنے لگے تو بھونکنے والے اس پر ادھر ادھر سے بھونکنے لگیں؟ میں یہ بات ارکانِ کانفرنس پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس اہم موضوع پر حتمی فیصلہ کریں۔

(دوم) میں نے بہت سے اسلامی حقائق پیش کئے ہیں جن کا جواب دینے سے دشمنانِ اسلام عاجز ہیں۔ انہوں نے اپنے تیردوں کا رخ لباس کے مسئلے کی طرف کر لیا

ہے اور خاص طور پر عورتوں کے لباس کی طرف۔ کیا وقار و احترام کا مطالبہ کرنا مجرم ہے یا قانون کی خلاف ورزی ہے؟

پھر میں نے عورت کے بارے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی اور بتایا کہ عورت کے مسئلہ کو دین سے جدا کرنے کے کیا کیا نقصانات ہیں۔ پھر میں نے اپنے ملک کے بے دین طبقہ اور بلا حیثیت زدہ افراد پر کھل کر تنقید کی۔

میں اپنی اس تقریر کے ذریعے ایک بار پھر معزز ارکان کو اسلام کی حمایت و تائید میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے قوانین کے سرکاری سطح پر نفاذ کے حق میں قوی جذبہ رکھتے ہیں۔

میں یہاں یہ بات ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسٹر کمال الدین حسین نے میرے خطاب کو خوب سراہا اور میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ حالانکہ ان کے سوا جتنے بھی ارباب حکومت تھے وہ گویا غصے سے پھٹے پڑے تھے۔

مگر جب میں نے اگلے دن کے اخبارات پڑھے تو معلوم ہوا کہ یہ گم راہانہ عدوت، تمام اخبارات و رسائل میں منتقل ہو چکی ہے۔ میرے خلاف اب کی بار حملہ، پوری سختی اور شدت سے ہوا تھا۔

کافر نس کے اندر کمیونسٹ ایک مرتبہ پھر متحرک ہو چکے تھے۔ میں نے بہت تنقید سنی۔ ایک خاتون نے.... جو وزیر سماجی امور تھیں.... میری مذمت اس طرح سے کی کہ خود مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس کی لغویات تو ناقابلِ سماعت تھیں۔

میری تیز مزاجی مجھے بہت نقصان پہنچا چکی ہے۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ اب میں گھنیا لوگوں کا موضوعِ سخن بن چکا تھا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے اب بے رحمی و بے دردی سے جوابی حملہ کیا۔ میں نے چھوٹے بڑے سب کو حقارت سے دیکھا اور ان پر خوب تنقید

کی۔ کچھ ذمہ دار سرکاری افسران نے مجھ سے ٹھٹھ کی درخواست کی۔

خیر ارکان کانفرنس کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے میری توہین کی ہے۔ انہوں نے صدر عبدالناصر کے نام ایک درخواست لکھی کہ مجھے تیسری مرتبہ کانفرنس سے خطاب کرنے دیا جائے تاکہ میں اس شور و شغب کو خاموش کر سکوں۔ صعد سے تعلق رکھنے والے کچھ ممبران درخواست اٹھائے ہال میں گھوم رہے تھے تاکہ حاضرین میں سے زیادہ سے زیادہ کے اس پر دستخط کروائیں۔ سینکڑوں ارکان نے تائید میں دستخط کئے۔ صدر جمال عبدالناصر نے اس حرکت کو نوٹ کیا۔ وہ کانفرنس میں ہونے والی ہر حرکت کے بارے میں باخبر رہتا تھا۔ درخواست اس کے پاس پہنچی تو اسے منظور کرنا پڑی۔

ارکان کانفرنس آدھ گھنٹہ آرام کے بعد، اپنی نشستوں پر واپس آنے لگے۔ میں اب تیسرے بار کے خطاب سے مایوس ہو چکا تھا لہذا میں نے پچھلی نشستوں پر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب کورم پورا ہو گیا اور حاضری مکمل ہو گئی تو جمال عبدالناصر کانفرنس ہال سے اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے ماضی قریب یاد آ رہا تھا۔ صرف چند سال پہلے یہی ایڈیٹر حضرات، اپنے اخبارات کو، میرے خلاف گھٹیا تنقید، بلکہ گالی گلوچ سے آلودہ کر رہے تھے۔ شاہ فاروق اور اس کے حامیوں کو خوش کرنے کے لئے..... پھر یہی ایڈیٹر حضرات، فوجی انقلاب کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو آزادی کا ہر اول دستہ سمجھنے لگے۔

انور السادات نے اجلاس کا افتتاح کیا۔ انہوں نے کہا ایک درخواست موصول ہوئی ہے جس پر بہت سے ارکان کے دستخط ہیں کہ شیخ غزالی ایک بار پھر سٹیج پر تشریف لائیں۔ یہ سنتے ہی ہال نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ تائیدی کوازوں سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سادات نے اطمینان سے اعلان کیا۔ رکن محترم تشریف لائیں اور خطاب فرمائیں۔

ادھر میں سلج سے دور، آخری لائن میں بیٹھا تھا۔ تالیوں کی اس گونج میں، مجھے حنفی فقیہہ امام ابو یوسفؒ کا قول یاد آیا کہ ”اے لوگو! اپنے عمل سے اللہ کی رضا کا ارادہ کرو۔ اللہ کی قسم ہے میں نے جب بھی اپنا کوئی عمل غیر اللہ کے لیے کیا تو مجھے رسوائی ہوئی۔“ یہ سوچ کر میں نے سر جھکا لیا۔ اپنے رب کو یاد کیا اور میں نے کہا۔ مجھے اُس ذاتِ باری کی خاطر اٹھنا چاہیے۔ مجھے رسوائی و ذلت ناپسند ہے۔ اگر میں لگاتار تالیوں سے غرور میں جتلا ہو گیا تو میرا عمل رائے گاں جائے گا۔ اگرچہ میں تقریر کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور حاضرین نے اسے پسند بھی کر لیا، مگر اللہ کے حضور، میری ناکامی کے بعد، اس کامیابی کی کوئی اہمیت نہیں۔

میں نے مدد رانی گرامی سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے کہ میں نے اسلام کی حمایت کی ہے اور اس کی کچھ تعلیمات کی وضاحت کی ہے۔ ہر شخص کو کسی بھی نظریہ و اصول کی طرف داری کی مکمل آزادی ہے مگر جب بات اسلام تک پہنچتی ہے تو پھر آزادی نہیں..... میرے خلاف شور و شغب کرنے والوں کی آوازیں اس وقت کہاں تھیں جب میں زبردستوں اور ناتوانوں کی حمایت کرتا تھا۔ میں غریبوں کی عزت نفس کا دعویٰ کرتا تھا۔ جب میں غریبوں اور ناداروں کے لیے عزت کی روٹی کا مطالبہ کرتا تھا۔ کہاں تھے یہ لوگ جب میں نے اپنی کتاب، ”الاسلام والاستبداد السیاسی“ لکھی تھی۔ یہ کتاب ان سخت بخرانوں کے دور میں لکھی گئی تھی جو قصر شاہی نے قوم کے خلاف پیدا کئے تھے۔ میں نے ان بہادروں سے کسی ایک کی بھی آواز، شاہی جبر و استبداد کے خلاف نہیں سنی۔ نہ ہی ان کی کوئی حرکت دیکھنے میں آئی۔ میں ایک سال تک ”طور“ میں قید رہا۔ جب کہ یہ لوگ اپنی عیاشیوں میں مست و مگن رہے۔

اب ہمیں ”رجعت پسند“ سمجھا جاتا ہے اور یہ ”ترقی پسند“ کہلاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ صحافیوں کا یہ رویہ، کیا اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم اسلام کا نام لیتے ہیں اس زمانے میں... تعجب ہے کہ شاہ فارق، جب شہوتوں کے دریا میں غرق تھا اس وقت یہی لوگ

..... جی ہاں، مجھ پر اس وقت تنقید کرنے والے لوگ... اس بے حیاء شاہ کے ہم نوالہ وہم پیالہ تھے۔“

اس کے بعد میں نے موضوع زیرِ بحث اور وجہ اختلاف پر کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ اب مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ میں نے اس موقع پر کیا کہا۔ ہاں مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ انور السادات نے مجھے تقریر ختم کرنے کے لئے کہا اور مجھے یاد دلایا کہ میں مقررہ وقت سے زائد وقت لے چکا ہوں۔ مگر میں نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔ میں نے اپنے دل کی بھڑاس خوب نکالی۔ یوں میں نے اس صدمے کا ازالہ کر لیا جو مجھے اور اہل ایمان کو پہنچا تھا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ الاہرام اخبار نے اپنے صفحات میں دس کارٹون شائع کئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب مجھ سے انتقام لینے کے لیے بنائے گئے تھے۔ مگر میں چوں کہ دل کی بھڑاس نکال چکا تھا۔ اس لیے اب کی بار میں نے، اس تمسخر کی پروانہ کی اور نہ ہی اپنے آپ کو شکست خوردہ و مظلوم سمجھا۔

میں نے جامع الازھر میں خطبہ دیا۔ میرا موضوع... ان دنوں زیرِ بحث مسئلہ... سے بالکل ہٹ کر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسجد میں بہت زیادہ بھیر ہے۔ نماز کے بعد میں صرف ایک منٹ کے لیے اپنی جگہ ٹھہر سکا۔ اس کے بعد تو مسجد دکھ اور غصے سے بھرے نمازیوں کے والمانہ نعروں سے گونج اٹھی۔ لوگ نعرہ بکیر بلند کرتے ہوئے رو رہے تھے۔ عوام نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ لوگ مجھے اٹھا کر چل رہے تھے۔ میں مسجد کے کسی بھی ستون کو تھام کر نیچے اتارنا چاہتا تھا مگر کیسے اور کہاں؟ ازھر کے ایک دروازے میں سے گزرتے ہوئے، میں نے دروازہ کو پکڑنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ پولیس والوں نے مجھے زمین پر اتارے اور ازھر کے دفتر میں داخل ہونے میں مدد دی۔ مسجد ازھر میں نمازیوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ اتنی تعداد میں لوگ مسجد الحسین اور قریمی مسجدوں سے آکر ان میں شامل ہو گئے تھے۔ اب جلوس الاہرام اخبار کے

دفتر کو نذر آتش کرنے کے لیے چل پڑا۔ جلوس جوں جوں اپنے ہدف کے قریب پہنچ رہا تھا، اس کی تعداد بڑھ رہی تھی مگر پولیس نے اخبار کو چانے کے لیے بھاری نفری طلب کر لی۔ غیظ و غضب میں جلا عوام مجبوراً منتشر ہو گئے۔ وزارت خارجہ کے ایک بڑے افسر نے کہا: ”اگر یہ مظاہرہ منظم ہو تا یا اسے باقاعدہ طور پر کیا جاتا تو یہ قاہرہ شہر کو جلا کر خاکستر کر دیتا۔“

اگلے دن کی صبح ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مظاہرے صرف قاہرہ شہر تک محدود نہیں تھے بلکہ صوبائی دارالحکومتوں میں بھی عوام اسلام کی حمایت اور علماء اسلام کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد محمد حسنین بیکل کی یہ تحریر پڑھ کر ہمیں ہنسی آئی کہ شیخ الغزالی نے اپنے کچھ شاگردوں کو الا حرام پر حملہ کرنے کے لیے اکسا بھیجا تھا۔

ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں اخبار کے دفتر پر دھواؤں لے کر لیے جانے والے عوام، کیا سب میرے شاگرد تھے جنہیں میں نے اکسایا تھا.... ہماری قوم، اپنے دین سے محبت کرتی ہے وہ صرف اسی دین کے تحت زندگی گزارنا چاہتی ہے اور اسی کے احکام و قوانین کا نفاذ چاہتی ہے۔

اب ہم کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوئے تو ہم خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال تھے۔ ہمیں جمال اور سادات کے چہروں پر چھائی ہوئی مایوسی اور ان کے دلوں میں موجود پوشیدہ غصے کی مطلقاً پروا نہ تھی۔

تجویز کردہ چارٹر کے بارے میں، جب مطلوبہ رپورٹ تیار کرنے کے لیے کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو میں نے شیخ سید سابق کے کان میں کہا کہ حقیقی کام شروع ہو چکا ہے لہذا اب اہم بات یہ ہے کہ مطلوبہ رپورٹ میں مصر کے اسلامی شخص کو اجاگر کیا جائے اور بائیں بازو کی لہر کو ناکام بنایا جائے۔

امرواقعہ یہ ہے کہ رپورٹ کمیٹی میں ہماری طرف سے پوری کوشش کی گئی۔ شیخ سید سابق اور کچھ دیگر مخلص و غیور ارکان نے اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ چنانچہ وہ کمیونسٹوں کا جال توڑنے اور مطلوبہ رپورٹ مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہاں اس بات کا صاف اقرار کروں کہ ہماری یہ ساری کوشش اکارت چلی جاتی اگر کمال الدین حسین جیسے صلہ مرد مومن کی عزیمت و صلاحیت نہ ہوتی۔ آپ نے ہر قسم کی مداخلت اور لغویات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ارکان کمیٹی کو مکمل آزادی دی۔ وہ ارکان محترم جو اسلام کے سوا کسی اور نظام کے خواہاں نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رپورٹ میں عقائدی لچک کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اس لچک کے ہوتے ہوئے تو تجویز کردہ چارٹر.... جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں... مشرقی یورپ کے ممالک کے لیے موزوں تھا اور مصری قوم کو اپنے دین اور اپنے شعائر سے کاٹ کر پھینک دینے والا تھا۔ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم اسلام پر ہی دار و مدار رکھیں گے، اسی سے مدد لیں گے۔ ہم نے جو رپورٹ مرتب کی وہ قرآن مجید کی بہت سی آیات پر مشتمل تھی۔ اس رپورٹ کا چارٹر کے ساتھ چھپنا ضروری تھا تاکہ یہ اس کا حتمہ بنے۔ کمیٹی کی رپورٹ جب پڑھی گئی تو اسے غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہوئی۔ یہ نتیجہ غیر متوقع تھا اور جمال عبدالناصر اس پر خوش نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ کمال الدین حسین اور جمال عبدالناصر کے مابین اختلاف اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خلیج وسیع ہوتی گئی حتیٰ کہ اپنے دین سے گہری وابستگی رکھنے والے اس شخص کمال الدین کو ہٹا دیا گیا۔ اس کی مادی زندگی تباہ کر دی گئی۔ اس نے اقتدار سے دُور رہ کر زندگی گزاری۔

صدر جمال نے اس رپورٹ کو روڈی خانے میں پھینکنے اور کانفرنس کے ارادے کو نظر انداز کرنے میں قطعاً کوئی دقت یا شرم محسوس نہ کی۔ اس نے مصریوں پر اپنی مرضی مسلط کر دی۔



جہاں تک انور السادات کا تعلق ہے وہ His Masters Voice ہے۔ وہ تو اپنے لیڈر کی خواہش سے بال برلہ بھی ادھر ادھر ہونے کی جرات سے محروم تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ وہ آدمی ہے جو ہر لمحہ اپنے آقا کی دلجوئی اور اس کو خوش کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

میں وزارتِ لوقاف میں اپنے کام پر واپس آیا۔ میرا دل اپنی کوششوں پر مطمئن تھا مگر دکھ اس بات کا تھا کہ کاش یہ کوششیں بارگور ہوتیں۔

اس معرکے سے، سب سے بڑی کامیابی جو مجھے حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ کچھ اخوانی، میرے خلاف جو پروپاگنڈا کرتے تھے وہ رک گئے۔ وہ زبانیں جو طویل عرصہ سے، میرے خلاف تند و تیز زہر اگل رہی تھیں، بند ہو گئیں۔ میں اس بات کو چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے اپنے بارے میں یہ سن کر بہت غصہ آتا تھا کہ حکومت کے ساتھ مل گیا ہے یا اس نے دنیا کی خاطر اپنا دین بیچ دیا ہے۔

میں اب بھی دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ دین داروں کے ایمان و خلوص پر حملہ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ گناہ ہے، اس لیے کہ بے گناہوں کے عیب ڈھونڈنے اور ان کے ایمان پر حملہ کرنے سے نیکیاں رائے گاں چلی جاتی ہیں۔

میں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا، میں خوب جانتا ہوں کہ میں اللہ کی مغفرت و بخشش کا کس قدر محتاج ہوں۔ مگر میرے بارے میں جو کچھ یار لوگوں نے پھیلا رکھا ہے میں اس سے کوسوں دور ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مواقع پر ان لوگوں کے جھوٹ کے پردے چاک کئے حالانکہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔

کانفرنس میں میرے موقف پر مجھے کسی فوری خطرے کا سامنا تو نہ کرنا پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ کچھ زیادہ ہی مکار اور کایاں ہیں۔ ان لوگوں نے چند ماہ تک انتظار کیا۔ پھر ایک وزیرِ لوقاف نے مجھے ڈائریکٹرِ مساجد کے عہدہ سے ہٹا کر انسپکٹرِ مساجد کے

منصب پر میری عزلی کر دی۔ یعنی ملازمتوں میں، پندرہ سال کی سیر حیاں چڑھنے کے بعد مجھے رجعت بہتری کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے اپنے خاص دفتر سے ہٹا کر ایک ایسے دفتر میں بھیج دیا گیا جہاں کچھ خواتین و حضرات ملازمت کرتے تھے۔

## مسجد کی حفاظت و تعمیر نو

ان سب تلخ واقعات کے رونما ہونے سے چند سال پہلے ایک فوجی افسر وزیر اوقاف بنے۔ یہ تھے احمد عبداللہ طحیمہ۔ میں نے ان سے بلا کر بھلائی کا پرستار اور خدمت اسلام سے سرشار شخص نہیں دیکھا۔ یہ صاحب نئی مساجد کی تعمیر، دعوت و تبلیغ میں اشہاک اور اس راستے کی رکاوٹیں دور کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔

میں ایک روز ان کی حمایت و تائید پر تکیہ کرتے ہوئے، ان سے ملا۔ میں نے کہا: ”میں نے الملتہ الکبریٰ میں اللہ کی رضا کی خاطر ایک ایسا کام کیا ہے ملکی قانون جس کی اجازت نہیں دیتا مگر مجھے آپ پر اعتماد ہے اور میں نے آپ ہی کے تعاون کی توقع پر یہ کام کیا ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے کیا کیا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”مسجد ابو الفضل الوزیری کے سامنے گر جا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی از سر نو تعمیر ہونے والی ہے اور اس کے برج بلند کئے جانے والے ہیں۔ اس صورت میں، گر جا کے سامنے کی یہ مسجد بوئی معلوم ہو گی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسجد کی ارد گرد کی زمینیں غلام کر دی جائیں گی۔ جنہیں قطبی عیسائی خرید لیں گے۔ یوں مسجد ہر طرف سے محصور ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ میں نے اس علاقے کے مسلمانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ ان زمینوں پر قبضہ کر لیں اور ان پر مسجد کی توسیع کا کام شروع کر دیں۔ میں نے پولیس میں اس کا پرچہ بھی درج کرادیا ہے۔ میں نے ڈائریکٹر مساجد سے کہا ہے کہ وہ اس پر عمل درآمد کی نگرانی کریں۔ مسجد کی از سر نو شاندار تعمیر کے لئے لوگوں سے عطیات وصول کریں۔“ وزیر اوقاف کافی دیر تک مجھے

دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کن وقف کنندگان کے نام یہ جائیداد مسجد میں شامل کی جائے گی۔ میں نے کہا: مجھے نہیں معلوم کہنے لگے۔ جلدی سے ایسے نام تلاش کیجئے اور پھر میرے پاس تشریف لائیے۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ جائیداد کو قانونی طور پر، مسجد میں شامل کر دیا گیا اور مسجد الوزیری کو نمونے کی مسجد کے طور پر تعمیر کرنے کے احکام صادر ہو گئے.... یہ سب کچھ اللہ کے فضل سے ہوا۔

یہ وزیر چوں کہ جذبہ اسلام سے سرشار تھے، اس لیے انہیں وزارت سے نکال کر، جنوبی امریکہ میں سفیر مقرر کیا گیا۔ جب یہ بیمار، دلیر اور طاقتور شخص وزارت سے نکلا، مجھے شاعر کے یہ شعر یاد آئے۔

اِنَّ الْاَمِيْرَ هُوَ الَّذِي..... يَضَعُ امِيْرًا يَوْمَ عَزْلِهِ

اِنْ ضَاعَ سُلْطَانٌ وَلَا..... يَتَعَلَّمُ يَضَعُ سُلْطَانٌ فَضْلَهُ

(حکم ران جب کسی عہدے دار کو معزول کرتا ہے تو حقیقت میں اُسے قربان کرتا ہے۔ اس امیر کے اقتدار کا دبدبہ تو جاتا رہتا ہے لیکن اس کی عظمت کو دار باقی رہتی ہے۔)

ہو سکتا ہے لوگ اس وزیر کی کاوشوں کو بھول گئے ہوں مگر اللہ تعالیٰ کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ مجھے یہ واقعہ یاد آیا ہے۔ میں اس کے بعد وزارت اوقاف میں اپنے معمولی دفتر میں سٹ چکا تھا۔ مجھے اپنے عہدہ سے تنزلی کے بعد، نشانہ ستم بنایا جا چکا تھا۔ اس کے بعد تو مجھے نت نئے ستم کا تختہ مشق بنایا گیا۔ ایک حکم کے ذریعے مجھے جامع ازھر میں خطبہ دینے سے روک دیا گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ بے کار رہنا بے فائدہ ہے۔ اب میں اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف پر دیتا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں اپنی تین کتابیں مکمل کر لیں۔ یعنی.... الجانب العاطلی فی الاسلام... معرکۃ المصحف... دفاع عن العقیدۃ والشریعت ضد مطاعن المصحرفقین۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی سرکاری ڈیوٹی معمول

کے مطابق سرانجام دیتا رہا۔ یہاں پر یہ بتانا بے عمل نہ ہو گا کہ وزارتِ اوقاف کے تمام ملازمین نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ وہ میری ناقدری پر اندر ہی اندر غصے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

## ایک نئی مصیبت... اور اللہ کی بے پایاں رحمت

مگر اچانک ایک غیر متوقع مصیبت آنازل ہوئی جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ میرے ناشر (پبلشر) نے مجھے بتایا کہ پولیس نے میری تین کتابوں کو پریس سے ضبط کر لیا ہے جن کا پبلائیڈیشن ختم ہو چکا تھا اور ان کی نئی طباعت ہو رہی تھی۔ ”مع اللہ“ اور ”النصیب والاشماع“ کو ضبط کر لیا گیا ہے جب کہ ”کفاحِ دین“ کو وزارتِ داخلہ نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ ایک اور چیز رونما ہوئی۔ میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ ایک فرمان جاری ہوا ہے جس کی رو سے تمام سنی و بھری ذرائعِ لبلاغ (ریڈیو، ٹیلی وژن) پر، میرا اکا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اگر ان تمام پابندیوں کو یکجا کیا جائے تو سرکاری مقصد بالکل واضح ہے یعنی مجھے ماویٰ اور اخلاقی لحاظ سے ختم کرنا اور میرے گرد گھیرا تنگ کرنا۔

یہ پریشانی کچھ زیادہ اس لیے محسوس ہوئی کہ میں نے الحجۃ میں اپنے لئے گھر بنانا شروع کیا تھا۔ اندیشہ تھا کہ اب میں اپنے اس کام کو مکمل نہ کر پاؤں گا۔ میرے اخراجات کے زیادہ تر سرچشمے خشک ہو گئے تھے، گزارہ دو بھر ہو رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں نے اپنی حاجت پیش کی۔ میں نے اپنے اندیشے اور دوسرے اپنے سینے میں محفوظ رکھے۔ اپنے دوستوں اور گھر والوں کے سامنے مسکراتا رہا۔ میرا سرمایہ روز بروز کم ہو رہا تھا۔ غم میرے دل کو کھا رہا تھا مگر میں اپنے آپ کو امید کے سہارے قائم رکھے ہوئے تھا اور اللہ کی جناب سے کشاد کا منتظر تھا۔

مجھے ستانے والے وزیرِ اوقاف جا چکے تھے۔ نئے وزیر نے اپنا منصب سنبھالنے

کے چند ہی دنوں بعد مجھے بلوا ابھجا۔ میں ان کے دفتر پہنچا تو انہوں نے بے ساختہ کہا: حکومت کویت نے آپ کو بلایا ہے تاکہ رمضان کا مہینہ آپ وہاں دعوت و وعظ میں گزاریں۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ میں نے کہا: نہیں جناب۔ چنانچہ انہوں نے مجھے سفر کی تیاری کے لیے کہا۔

میں نے کویت میں ایک مہینہ گزارا۔ میرے لیے قاہرہ میں جو کچھ ممنوع تھا وہ کویت میں، میرے لیے روا تھا۔ میں بڑی بڑی مساجد میں گیا۔ پریس کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو میں بیعت سے درس ریکارڈ کروائے۔ اپنی دسیوں کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں وہاں کے ناشرین سے معاہدے کیے۔

قاہرہ میں ہر رنگ کے کمیونسٹ اور ہر طرح کے ملحد کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی مگر میرے لیے وہاں اسلام کی کوازی بلند کرنے پر پابندی عائد تھی۔ اگر قاہرہ مجھے اجازت دیتا تو کیا ہو جاتا؟

میں اپنے دل کی گہرائیوں سے ان لوگوں سے نفرت کرتا ہوں جو حریت و آزادی کا نعرہ لاپتے ہیں مگر جب اللہ والے بات کریں، عوام ان کو سننے کے لئے لپکیں تو ان "آزادی پسندوں" کے گلے ڈر سے خشک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ فلاں فلاں کورو، ان کی زبان بھدی کرو۔ انہیں عوام کے پاس جانے نہ دو، تاکہ عوام ان کی جھٹ و دلیل کو نہ سن پائیں۔ اس حرکت کے بعد بھی یہ لوگ پوری بے شرمی و ڈھٹائی سے کہتے ہیں۔ آزادی، ترقی، سیکولر ازم.... گویا آزادی صرف ان کے لئے ہے جب کہ جیلیں ان کی رائے سے اختلاف کرنے والوں کے لئے ہیں۔

کویت جانے سے پہلے میں ان برائوں سے خوف زدہ تھا جو مجھ پر ناگمانی طور پر آپڑے تھے۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے بارے میں مجھے ایک حدیث یاد تھی کہ یہ ایک ایسا مہینہ ہے یزاد فیہ رزق المومن "اس میں مومن کے رزق میں اضافہ کیا

جاتا ہے ”مجھے کویت سے واپسی پر اس بات کی مسرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان مومنوں میں شامل کیا ہے جن کی مدد کی جاتی ہے۔ میں نے اپنے تمام اوصوے کام پورے کر لیے۔ ارباب اقتدار کو میری غربت و افلاس کا احساس نہ ہو سکا۔ میرے رب نے اپنے کرم و احسان سے مجھے ارباب اقتدار کے در کی محتاجی سے چھلایا۔

ایک دن سیکرٹری وزارتِ لو قاف مسٹر حسین الشافعی نے مجھے بلا بھیجا اور جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے کہا۔ انہوں نے میرے لیے میدانِ آزادی میں مسجدِ عمرِ مکرم کا انتخاب کیا۔ میں نے اس مسجد میں جا کر اپنے فرائض سنبھال لیے۔ جوں ہی لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں وہاں جمعہ پڑھایا کروں گا وہ ہزاروں کی تعداد میں وہاں آنے لگے۔ مسجد اور اس سے ملحق میدان نمازیوں سے بھر جاتا تھا۔

وزارتِ داخلہ نے ایک دفعہ پھر، میرے ظہور پر اعتراض کیا۔ وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری پروفیسر القرمانی نے میرے کان میں کہا کہ میں بذاتِ خود ہی جمعہ پڑھانے سے معذرت کر لوں یہ جائے اس کے کہ مسٹر حسین الشافعی، وزارتِ داخلہ کے متعلقہ افسران کے ساتھ ابھیں اور انہیں پریشانی ہو۔ چنانچہ میں نے خطبہ دینے سے معذرت لکھ کر بھیج دی۔

ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے مختص کر دیا جو میرا اصل مشن تھا۔ میں عام مساجد اور عوامی مجالس میں جانے لگا۔ میں نے، دینی جذبہ کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا۔ اسلامی ثقافت کے پھیلاؤ اور فکری و خلقی انحراف کو روکنے میں مصروف ہو گیا۔ اس حرکت سے بہت مدد ملتی ہوئی۔ اہل ایمان کا ایک لشکرِ جبار تیار ہو گیا۔ وہ مثبت نتائج سامنے آئے جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

دشمنانِ اسلام نے بھانپ لیا کہ مصری قوم اپنے دین سے گہری وابستگی رکھتی ہے، دینِ اسلام کی سر بلندی اور اس کے قوانین کا احیاء چاہتی ہے۔ دباؤ میں آکر یہ قوم سختی و

سکرتی تو ہے مگر جوں ہی سنبھلتی ہے تو فوراً دین کی طرف واپسی کا مطالبہ کرتی ہے۔  
 ساتھ کے عشرے کے لواٹل میں، مصر کا رخ کیونرم کی طرف تھا۔ سرمایہ داروں  
 کے خلاف سخت احکام صادر ہو رہے تھے۔

## فرعونى روش

جمال عبدالناصر ماسکو کے دورہ پر گیا تو وہاں اس سے کہا گیا کہ اسلامی جماعتوں  
 .... بالخصوص اخوان المسلمون .... کو اگر یوں ہی اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے دی گئیں تو اس  
 سے اشتراکیت کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ جمال نے اخوان کے خلاف اعلان جنگ  
 میں ذرا تاخیر نہ کی۔ اس نے ماسکو سے ہی اخوان کو کچلنے کی دھمکی دے دی۔ ملک کی افواج  
 کو، جس مالو کے ساتھ حرکت دی گئی وہ تھا، ”دہشت گردی کا خاتمہ“۔

انسان دورِ قدیم کے فرعونوں اور مصر حاضر کے فرعونوں کے نابین مکمل ہم آہنگی  
 دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو  
 رمیس .... فرعون مصر کے پاس بھیجا تو انہوں نے فرعون سے کہا... فارسل معنا  
 بنی اسرائیل ولا تعذبہم (طہ۔ ۴۷) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے  
 لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ معجزات دیکھنے کے بعد فرعون نے کہا۔ اجنتنا  
 لتخو جننا من ارضنا بسحرک یا موسیٰ (طہ۔ ۵۷) اے موسیٰ! کیا تو ہمارے  
 پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے۔ حضرت  
 موسیٰ علیہ السلام اس سے کہتے ہیں۔ تم تمنا ملک میں رہو اور میرے ساتھ ان لوگوں کو  
 بھیج دو جن پر تم نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ فرعون جواب دیتا ہے کیا تو  
 ہمیں، ہماری سرزمین سے نکالنا چاہتا ہے۔ فرعون حقائق کو مسخ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ذرونی اقتل موسیٰ ولید ع ربدہ، اتی اخاف ان یبدل

دینکم او ان بظہر فی الارض الفساد (النومن-۲۶) چھوڑ دیجھے، میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں، اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا.... فرعون، اس بات سے خوف زدہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ملک میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

تہمت تراشی کا یہی طریقہ، بے گناہوں پر الزام لگانے کا یہی پرانا دستور، داعیان اسلام کے بارے میں بھی استعمال ہوا۔ حامیان اسلام کے بارے میں کہا گیا کہ یہ دہشت گرد ہیں، دہشت پسند ہیں۔ اگر یہی ”دہشت گرد“ ارباب اقتدار سے یہ کہیں کہ تم ہمیں مار ڈالو، ہم اس پر خوش ہیں مگر ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی حکم رانی ہونی چاہیے اور اسے ہر میدان میں لاگو ہونے دیا جائے۔ کیا ارباب اقتدار اس کے لیے تیار ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ ان کی لڑائی تو ہے ہی خود اسلام کے خلاف۔

## گرفتاری

اسلام پر ضرب کاری لگانے کے لیے ایک ہی رات میں 18 ہزار افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سب لوگ اسلام کی سر بلندی کے لیے کوشاں تھے۔ ان ہزاروں میں میں بھی شامل تھا۔

اس رات کے واقعات بیان کرنے سے پہلے، میں اپنی گرفتاری اور ”طرہ“ جیل میں ڈالے جانے کا اور راست سبب بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے ریڈیو سٹیشن بلایا گیا۔ میں وہاں گیا تو کئی علماء کرام اور سابق اخوانوں کو موجود پایا۔ وہاں پر تبصرے ہو رہے تھے۔ صدر مملکت نے دہشت گردوں کی خرابیاں اور برائیاں بیان کرنے کا حکم دیا ہے۔ قوم کو دہشت گردوں پر اعتماد کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے سے روکنے کے لیے کہا ہے۔ لہذا یہ قومی فریضہ جلد از جلد ادا ہو جانا چاہیے۔



میں کرسی پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ریڈیو پروگرام ریکارڈ کرنے والے ذمہ دار افسران نے میری اس کیفیت کو بھانپ لیا مگر نظر انداز کر دیا۔ پھر انہوں نے مجھے ریکارڈنگ کرانے کے لیے کہا۔ اس لیے کہ مجھے اخوان سے نکالا گیا تھا۔ میں نے سختی سے جواب دیا۔ ”میں اسلام کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اسلام کے ان احکام کے بارے میں بات کرنے پر آمادہ ہوں جنہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میں خطا کاروں کی راہ نمائی کے لیے مستعد ہوں خواہ غلط کار کا نام ہوں یا محکوم، تاکہ غلطیوں کی اصلاح ہو سکے۔ مگر میں، صرف اخوان کو گالیاں دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ زخمی شخص پر وار کرنا، میرا دطیرہ نہیں ہے۔“

مجھے کہا گیا۔ ”ان لوگوں نے آپ کو، اپنی جماعت سے الگ کیا ہے تو پھر آپ ان کا کیوں لحاظ کرتے ہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر انہوں نے اپنے بھلے دنوں میں مجھے کم زور سمجھا تو میں اپنے ایام آزادی میں، انہیں ہر گز کم زور نہیں کروں گا۔“

اس کے چند ہی گھنٹوں بعد، میرے ہاتھوں میں جھکڑیاں تھیں۔

نصف شب کے ایک آدھ گھنٹہ بعد پولیس آئی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ پولیس اچانک اندر گھس آئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے لگی۔ پولیس افسران نے بیوی اکساری سے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پوزیشن سمجھ گیا۔ میری ایک بیٹی جاگ اٹھی تھی۔ اس نے چلا کر کہا: بلبل۔ میں نے اس کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ پھیرا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: بیٹی ڈرو نہیں۔ میں انشا اللہ جلد واپس آ جاؤں گا۔ میں نے بیوی سے اپنا سوٹ کیس تیار کرنے اور اس میں چند جوڑے کپڑے رکھنے کے لیے کہا۔

پولیس کی گاڑی مجھے لے کر طرہ جیل پہنچ گئی۔ فوجی افسر نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اُس نے مجھے شہری لباس اتارنے اور جیل کی وردی پہننے کا حکم دیا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے ایک بار پھر مجھے غضب آلود نگاہ سے دیکھا اور چلا کر کہا۔ ”تمہارے پاؤں

میں جرائیں ہیں۔ انہیں پہننا ممنوع ہے۔“ میں نے جرائیں اتار دیں۔ دو فوجی مجھے ایک کوٹھڑی میں لے گئے اور مجھے اس کے اندر چھوڑ آئے۔ اندر معمولی سی روشنی تھی۔ ایک طرف قضائے حاجت کے لیے ایک ڈبہ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ڈھکن پڑا تھا۔ فوجی دروازہ بند کر کے چلے گئے اور مجھے تنہا تاریک کوٹھڑی میں چھوڑ گئے۔ دروازے سے جو تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی، دروازہ بند کرنے سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ البتہ چھت میں ایک سوراخ تھا جس کے راستے سے آسمانی روشنی اندر آ سکتی تھی۔

جو کچھ ہوا یہ سب بالکل اچانک تھا۔ تصورات سے بعید تر... میں تاریک کوٹھڑی میں پڑا یہ سوچنے لگا کہ میں یہاں کیسے رہوں گا؟ اور کس طرح رہوں گا؟ کیا مجھے بہت زیادہ اذیت دی جائے گی۔ میں اسی سوچ چار میں ڈوبا ہوا تھا کہ فجر کی اذان سنائی دی۔ میں نے انگل سے قبلہ کی سمت کا تعین کر کے نماز پڑھی، میرے پاس ایک شلوار تھی۔ اس میں بچتے لپٹے۔ اس کا تکیہ بنایا اور زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے رب کے حضور دعا کی۔ ”میرے پروردگار! میں نے اپنی لگام تیرے ہاتھ میں دے دی ہے۔ تجھ پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر توکل کیا ہے۔ میرے رب مجھے خوش دے۔ رحم فرما اور تیرے رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ میں اپنے خاندان کے بارے میں کبھی نہ سوچوں گا۔ وہ تیری امان میں ہے۔ میرے اہل و عیال کا تو ہی بہترین محافظ ہے۔“

اس دعا کے بعد میں گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ سورج نکلنے پر میں جاگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک گہریلا، گڑھوں اور سوراخوں سے بھرے فرش پر ریگ رہا ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ ”تجھے کب گرفتار کر لیا گیا؟ سلامتی کے ساتھ رہ۔ میری طرف سے تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

میں نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی اور تہیہ کر لیا کہ چار دنوں میں قرآن شریف کا ختم کر لیا کروں گا۔ جیل میں ملنے والا کھانا بالکل بے کار ہوتا تھا۔ اُسے کھاتے ہوئے

کھین محسوس ہوتی تھی البتہ اس سے جسم و جان کا رشتہ بد قرار رہتا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں جس بات سے خطرہ تھا وہ سردی تھی جو چھت کے سوراخ سے اندر آتی تھی۔ دنیا کے ساتھ میرا یہ واحد رابطہ تھا۔ رات کو دائیں یا بائیں کروٹ بدلتے ہوئے مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے سرد ہوا کی لہر میرے پہلو کو چیر کر میرے وجود میں داخل ہو رہی ہے۔ مگر مجھے یہ سب برداشت کرنا تھا۔ بھاگ کر کہاں جاسکتا تھا؟

جیلر کی آنکھوں میں، اپنے لیے کچھ ہمدردی پائی تو میں نے اس کی منت کی کہ وہ میرے لیے کچھ کرے۔ وہ گیا اور میرے لیے پوری کا ایک بڑا سا ٹکڑا لے آیا۔ میں نے اسے جھوٹا لیا۔ دو روڈی کمبلوں کو پلو رلیف اوڑھ لیا۔

جیل میں مدد اخوانی قیدیوں کو میری آمد کا پتہ چل گیا۔ ان میں سے کچھ رضا کارانہ طور پر جیل کے عملہ کے ساتھ قیدیوں کی خدمت اور صفائی میں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے میری کوٹھڑی کی صفائی کا فیصلہ کیا اور وہاں پڑی غلاظت کو اٹھا کر لے گئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے راحت پہنچانے والے صاحب اخوانی تھے اور ایک ہائی اسکول میں ٹیچر تھے۔ ایک دن صبح سویرے یہی شریف النفس معلم صفائی کے لئے آئے، ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جو سماجی امور کے ماہر تھے۔ یہ بھی اخوانی تھے اور جیل میں مدد تھے۔ ان دونوں نے صفائی کا کام شروع کر دیا۔ میں نے مصر کے ان نوجوانوں کو یہ کام کرتے دیکھا تو مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ میں نے سوچا کہ ان کی توہین محض اس لیے کی جا رہی ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس سوچ نے مجھے جھنجھوڑا ڈالا۔ مجھے شدید صدمہ پہنچا مگر میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا اور خاموشی سے روتا رہا۔ ان کے آنے کی آہٹ پا کر میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات کی۔ میں نے جواب دیا تو میری آواز حدت غم سے ہٹرائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں معزز افراد حیران ہو کر کہنے لگے۔ کیا آپ رورہے تھے؟ میں نے

کہا۔ ”واللہ آپ دونوں اور آپ جیسے مسلم نوجوانوں کی خاطر“ وہ ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ ”یہاں کوئی اذیت نہیں۔ ہم یہاں آرام سے ہیں۔ اذیت دہی کا عمل تو فوجی جیل میں ہے، قلعہ میں ہے اور فلاں فلاں جیلوں میں ہے۔ (انہوں نے کئی مقامات کے نام لیے) تکلیفیں تو وہاں ہیں۔ ایسی تکلیفیں جو ہمارے وہم و گمان سے بھی ماوراء ہیں“

میں نے اپنی کتاب ”قذائف الحق“ میں، ان نوجوانوں پر کیے جانے والے تعذد کی کچھ اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ کتنے نوجوان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، باقی ماندہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، کتنے پوری زندگی کے لیے آرام و سکون سے محروم رہے۔ خود زندگی کی لذت سے ہی بے گانہ ہونے والوں کی تعداد کا اللہ کے سوا، کسی کو علم نہیں۔ یہ سزائیں، یہ اذیتیں، یہ تعذد سب کچھ اس لیے تھا کہ امت کو، اس کے دین سے ہٹا دیا جائے تاکہ وہ اسلام کو بھول جائے اور کتاب و سنت کی طرف دعوت دینے کا کام چھوڑ دے۔

یہ سیاہ مصائب دین اسلام کے کارکنوں پر اس وقت ٹوٹے جب اسے ہزیمت کا سامنا تھا۔ ہزاروں نیک نوجوانوں نے، حق کی وفاداری کا دم بھرا۔ یہ سب اللہ کے لیے مخلص تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسلام اور فرزند ان اسلام پر ضرب کاری کی شنیع حرکات کا ارتکاب اقتدار پر قابض ہونے والا ہر مہم جو کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی تو کمیونزم کا خدمت گزار ہوتا ہے اور کوئی صلیبیت کا وفادار۔

صلیبی ہوں یا کمیونسٹ دونوں یہودیوں کے خادم ہیں۔ ان دونوں نے ملی بھگت سے اسرائیل کو جنم دیا ہے۔ یہودی ہوں یا صلیبی دونوں اپنے سیاسی لائحہ ہائے عمل کو اپنے عقائد پر استوار کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم مسلمانوں کے یہاں عقیدہ ہی سب سے معمولی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ہر ایرا غیراء اسلام کو ہدف تنقید اور نشانہ ہمزولز بناتا ہے۔ اس کے باوجود وہ یوں آزادی سے رہتا ہے گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

میں اپنے خیالات کے میاؤں میں کہاں سے کہاں چلا گیا؟ میں واپس آتا ہوں اس

صورتِ حال میں، جس میں جلتا تھا۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں، میں نے گھر والوں کو یاد کیا۔ اپنی تنہائی و بے بسی کو یاد کیا۔ مگر جلد ہی میں نے اپنے آپ کو اس کم زوری پر ملامت کی۔ میں نے تو انہیں اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ تو اب ڈرنے کا کیا مطلب؟ میں طور کی جیل میں تقریباً ایک سال تک رہا تو میرے اہل خانہ کو کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ فلاں صاحب کی سچی چھوٹی سی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا، جیل سے نکلا تو اس کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے دور رہا مگر کیا اللہ بھی اس کی بیٹی سے دور رہا۔ بالکل نہیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ میں نے سوچا تو پرسکون ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ قرآن کریم میں تدبیر کروں گا جب تک یہاں رہا۔ میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیئے جانے والے اس حکم الہی کو اپنا نصب العین بنانے کا تہیہ کر لیا۔

واذکر اسم ربك و تبثّل الیہ تبثیلاً۔ رب المشرق والمغرب لا الہ الاّ هو فاتخذہ وکیلًا (المزمل۔ ۷۳۔ ۷۸، ۸۰) اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اس کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں لہذا اسی کو اپنا وکیل بنالو۔

میں نے اپنے علمی منصوبے پر عمل درآمد کا پروگرام بنالیا کیوں کہ مستقبل قریب میں رہائی کی کوئی امید نہ تھی۔

ایک رات عشاء کی نماز پڑھ چکا تھا کہ خلاف معمول شور سنا۔ دروازہ کھلا۔ روشن دان سے ایک تار اندر آئی۔ جس کے ساتھ جلی کا بلب تھا۔ ایک بڑا افسر اندر کیا جسے میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سمجھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ شیخ غزالی! آپ کو کوئی چیز چاہیے؟ میں نے کہا: میرے کپڑے آپ کے پاس ہیں۔ اس نے حکم دیا تو وہ کپڑے فوراً پیش کئے گئے۔ میں نے وہ کپڑے پہن لیے۔ مجھے جیل سے دفتر لے جایا گیا۔ یہاں میں نے دس دنوں میں، پہلی مرتبہ شیشے کے گلاس میں پانی پیا۔ اب کار مجھے وزارت داخلہ کے دفاتر میں لے گئی۔ میں نے دل

میں کہا۔ اب تفتیش شروع ہوگی۔

میں دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھے افسر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس سے کچھ دور ہٹ کر کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو سوالات کا جواب دینے کے لیے تیار کر لیا۔ وہ مجھے کہنے لگا۔ تفضل۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ مگر وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی نہ تھی۔ اس نے دوسری بار پھر کہا۔ تفضل۔ میں نے جواب میں کہا۔ میں کیا کروں؟ اس نے کہا۔ تفضل عدالی بیتک۔ اپنے گھر تشریف لے جائیے۔

باہر نکلا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں وزارتِ داخلہ کے دفاتر کے ساتھ ساتھ تھوڑی دیر تک چلا تو دیکھا کہ ایک شان دار عمارت پر ”اللہ“ کا اسم گرامی لکھا ہے اور وہ بجلی سے روشن ہے۔ میں لفظ جلالہ ”اللہ“ کو چومنے کے لیے بہت بے قرار ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مقدس لفظ کو بوسہ دوں۔ مگر کیسے؟ میری محبت میرے دل میں ہی رہ گئی۔ میں نے گھر جانے کے لیے ٹیکسی لی۔ قاہرہ شہر کا منظر، میری آنکھوں کے لیے عجیب تھا۔ میں کچھ دیر پہلے کنوئیں میں تھا اور اب روئے زمین پر ہوں۔ زندہ ہوں، آزاد ہوں۔ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ آزادی کتنی حسین ہے اگر اس کے ساتھ امن ہو، ایمان ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اگر میری قید ختم کر دی تھی تو اس ذاتِ عظیم کی نعمتوں کا شکر میں یوں ادا کر سکتا تھا کہ میں دوسروں کی قید ختم کرنے کے لیے کوشش کروں۔ میں لوگوں سے کہوں۔ اللہ برحق ہے اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے دنیا و آخرت کی کامیابیاں یقینی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مومنوں میں سے، سب سے کم تکلیف مجھے ہی برداشت کرنا پڑی، تاہم، میں ہر دم اللہ سے اس کی عافیت کا طلب گار رہا۔ کسی بھی تکلیف و مصیبت میں اسی کی طرف فوراً رجوع کیا۔ میں ہمیشہ اپنے لیے اور اللہ کے دوسرے بندوں کے لیے خیر و عافیت کا متمنی رہا۔

جیل سے رہائی کے بعد، میں اپنی سرگرمیاں از سر نو، جاری رکھنے کی تیاری کر رہا تھا

کہ میرے غریب خانہ پر انجیلیر احمد عبدالرشید باصی اور شیخ احمد حسن الباقوری تشریف لائے۔ میں نے اپنے ان معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ رہائی کی مبارک دینے کے بعد شیخ باقوری نے کہا۔ ”آپ جانتے ہیں، آپ کو کس نے رہا کیا ہے؟“ میں نے بہ آواز بلند یقین و جذبہ کے ساتھ کہا۔ ”اللہ نے۔“ میرا لہجہ ایمان و ایقان اور رب العزت کی تقدیر پر راضی رہنے سے معمور تھا۔ اس ایمان کے احترام میں، کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر انجیلیر الرشید باصی نے نرمی سے کہا۔ ”یقیناً، ہر فضل و کرم کے پیچھے اللہ کا دستِ قدرت ہوا کرتا ہے۔ بھلائی کی کنجیاں بھی ہوتی ہیں جو اللہ کے فضل و کرم کا ہیمانہ بنتی ہیں۔ آپ کے معاملے میں بھی کسی شخص کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے یہ بھلائی کروائی ہے؟“ میں نے حیران ہو کر کہا: ”وہ کون ہے۔“ انجیلیر صاحب نے جواب دیا۔ ”صدر جمال عبدالناصر۔ جب وہ المغرب کی کانفرنس سے واپس آئے تو انہیں رپورٹ دی گئی کہ ان کی ملک سے غیر موجودگی میں ان افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ فرست میں آپ کا نام بھی تھا۔ صدر نے پوچھا۔ اس نے کیا کیا تھا؟ جس کا کوئی مناسب جواب نہ دیا جاسکا۔ اس پر صدر نے آپ کو فوراً رہا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ رات کو اُس وقت آپ کی رہائی عمل میں آئی۔“

اس اطلاع نے میری زبان بند کر دی۔ میں نے قصرِ عابدین جاکر، ملاقاتیوں کے رجسٹر میں اپنے تاثراتِ تشکر لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا کل جمعہ ہے۔ میں پرسوں یعنی سہ پہر کو اپنا یہ فرض پورا کروں گا۔

مگر سہ پہر کا دن آنے سے پہلے ہی میری بڑی بیٹی کے خاوند کو گرفتار کر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں نے کہا: اب کیا یہ شخص شکر یہ کا مستحق ہے؟ اُس کی اس حرکت کے بعد شکر یہ کس بات کا؟ اب تو میں ہر گز شکر یہ ادا کرنے نہیں جاؤں گا۔ میرا امداد چار ماہ تک جیل میں پڑا رہا۔ پھر رہا ہوا اُس سے کچھ پوچھا گیا نہ اس پر کوئی الزام لگا۔

## ڈکٹیٹر شپ کی خرابیاں

میں نے محسوس کیا کہ اسلام کے لیے کام کرنا جان جو کھوں کا کام بن چکا ہے۔ اسلام کے راستے پر چلنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ کسی شخص کا لائق، ذہین اور قابل ہونا ایک جرم بن چکا ہے۔ اسے پیچھے رکھا جاتا ہے۔ اسے حقیر سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک متقی، جری اور صاحب علم کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا ہے۔ جمال عبدالناصر کی اسلام پسندوں کے خلاف اس کارروائی اور پکڑ دھکڑ کے نتیجے میں مسجدیں نوجوانوں سے خالی ہو گئیں صبح کی نماز میں تو صرف بے چارے بوڑھے کھوسٹ ہی شامل ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ شخصی حکومت کسی فرد کو کلمہ حق کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ کسی سے یہ سننے کی روادار نہیں۔

خلقت عیوفاً لا اری لابن حرة... علی یدا اغضی لها حین یغضب  
ڈکٹیٹر تو ایسے آدمی کو ترجیح دیتا ہے جس میں کوئی عیب ہو، تاکہ وہ اس کے عیب پر پردہ ڈال کر، اس کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دے۔ اسے غلام کے طور پر سامنے کھڑا رکھے۔ آمر کسی پاک باز، باصلاحیت، بلند کردار کے حامل شخص کو کبھی پسند نہیں کرتا جو حق تک پہنچنے کا مطالبہ کرے اور بے خوف و خطر حقائق کا اظہار کرے۔ اس کے یہاں ایسے شخص کے لیے جگہ ہے نہ وہ اسے زندہ رہنے دیتا ہے۔

خوشامد اور قرب چالو کرنسی ہے، جب کہ مہارت اور پاک دامنی تمنے نہیں رکاوٹیں ہیں۔

خوشامد اور تقرب کی ”پالیسی“ مصر کی ہر چیز پر مسلط کی گئی۔ اس مصیبت یا نعمت کا اولین میدان تھا فوج اور اس کے بعد ازھر۔

شاہ فاروق کے دورِ حکومت میں جاگیرداروں کے خلاف برسرِ پیکار لوگوں میں



سے، میں ایک تھا۔ اب ”انقلابی دورِ حکومت“ میں جاگیر داری نے نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ اب میں کس کس جاگیر دار کے خلاف نبرد آزما ہوتا۔

عبود پاشا سینٹ کی کمپنیوں، کشتیوں اور چینی وغیرہ کے ذریعہ سرمایہ دار بنا تھا۔ میں نے پوچھا کہ فلاں آدمی کیسے سرمایہ دار بنا، قوی اسمبلی کا رکن بنا۔ بتایا گیا کہ منشیات کی تجارت سے۔ یعنی اوّل الذکر تو قوم کا دشمن تھا کیوں کہ اس نے جائز اور قانونی ذرائع سے سرمایہ اکٹھا کیا تھا مگر موخر الذکر عوام کا دوست تھا کہ اُس نے حرام طریقہ سے، خوشامد اور رشوت سے مال اکٹھا کیا تھا۔

میں پوچھتا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا جرم ہے جنہیں عقوت خانوں اور قید خانوں میں ڈالا گیا ہے؟ کیا ان میں سے ہر شخص کو محض اس جرم کی پاداش میں سزاؤں اور اذیتوں کا سامنا ہے کہ وہ کتا ہے ”میں اسلامی حکومت چاہتا ہوں“

کب تک ان لوگوں کو جیلوں میں ڈالا جاتا رہے گا؟

اس طرح کے بہت سے سوالات تھے جو میرے دل و دماغ میں اٹھ رہے تھے۔ میں ایک ایسے راستے پر چل رہا تھا جو تلواریں سے تیز اور بال سے بازیک تھا۔ میں ان گھناؤں تاریکیوں میں، دعوتِ اسلام کے وجود کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

## ذلت ناک شکست

1967ء کا سال کیا۔ ہم نے اپنے کرتوتوں کا تلخ پھل کاٹا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ

تھا کہ ذلت و رسوائی اتنی بھیانک اور تاریک ہوگی اور یہ کہ ہم ایسی ذلت و عار سے دوچار ہوں گے۔

ہائے افسوس میرے شکست خوردہ وطن پر اور میری فریب خوردہ قوم پر۔ صرف بیس منٹوں میں، ہمارے ایرپورٹ (فضائی مستقر) تباہ کر دیئے گئے۔ ہمارے جہازوں کو زمین

پر ہی جلادیا گیا۔

چونکہ ہمارے ملک کا ذریعہ ابلاغ ان دنوں دنیا کا سب سے بڑھ کر جھوٹا ذریعہ ابلاغ تھا اس لیے اطلاعات کے دونوں بازوؤں یعنی پریس اور ریڈیو نے عوام کو یقین دلانا شروع کیا ”ہم نے یہودیوں کے جہاز تباہ کر دیئے ہیں۔“ مگر چند ہی دنوں کے بعد اس جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ فوجی، کچھ تو مارے گئے، کچھ قید ہوئے اور کچھ بھاگ نکلے۔

اس جنگ سے پہلے کی بات ہے، ایک دن میں نے سوچا (شاید اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہوئے سوچا) کہ اب فوجی حکومت قائم ہے۔ اس حکومت کے زیر سایہ ہم بلا شبہ قول و عمل کی حریت سے محروم ہیں۔ اگرچہ آزادیاں ہمارے مادی و اخلاقی مفادات کے لیے لازمی ہیں۔ تاہم اس سب کے باوجود اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک میں فوجی حکومت کا وجود زیادہ مفید ہو گا۔ ہمارے فوجی حکمران ایک مضبوط فوج بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ ہمارے ملک کے تمام ذرائع کو جنگ میں فتح یابی کے لیے استعمال کریں گے۔ اس لیے جنگ کرنا اور اس کے لیے تیاری کرنا تو ان کا خصوصی شعبہ ہے۔

مگر حقائق و واقعات نے میری اس خوش فہمی کا پردہ چاک کر دیا۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ شخصی ظالمانہ حکومت کوئی بھی معرکہ سر نہیں کر سکتی۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں سب سے بڑی شکست اسی میدان میں ہوتی ہے جس میں وہ مہارت کے مدعی ہوتے ہیں۔ (یہ عجیب بات ہے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا الم ناک قومی سانحہ فوجی حکومت کے عہدِ نفس میں رونما ہوا۔ پاکستانی علاقے سیاحین پر بھارتی تسلط بھی ایک فوجی آمر کے دورِ آمریت میں ہوا۔ (م۔ ظ۔ بھٹن)

جمال عبدالناصر اپنے دورِ حکومت میں کوئی بھی معرکہ جیت نہ سکا۔ سوائے ایک ”معرکہ“ کے جو اس نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف لڑا۔ اسلام کے خلاف اور انسانوں کی عزت و وقار کے خلاف لڑا۔ اس معرکہ میں اسے ضرور ”کامیابی“ ہوئی۔ وہ ہزاروں گھروں

کو اجازت دے اور ہزاروں بے گناہوں کو جیلوں میں ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ وہ سرزمین یمن میں ایک لاکھ مسلمانوں کو دفن کرنے میں کامیاب ہوا۔ مصر میں علانیہ اور خفیہ طور پر قتل کئے گئے مسلمان الگ ہیں۔

جھوٹے ذرائع ابلاغ نے بھی کمال کر دیا۔ شکست کے باوجود انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ وہ کہتے تھے کیا آپ کا خیال ہے کہ ہمیں شکست ہوئی ہے؟ بالکل نہیں۔ دشمن اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکا۔ کیا آپ نے اس سے بڑی ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی کہیں دیکھی یا سنی ہوگی؟

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب پراپیگنڈہ مہم البعث العربی کے پروپیگنڈوں سے منقول ہے جنہیں شکست کے بعد تیار کر لیا گیا تھا۔

اسرائیل کئی سالوں سے اپنے جھٹکا بڑا حصہ، تمام عرب ممالک میں اسی قسم کے فوجی انقلاب برپا کرنے کے لیے خرچ کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس سے اس کا رقبہ بڑھتا ہے، اس کی سلامتی یقینی ہوتی ہے اور اس کا حال مستقبل محفوظ ہو جاتا ہے۔

ازہر اور ادقاف میں ”احد کی شکست“ کے زیر عنوان پروپیگنڈہ کیا جانے لگا۔ خدا لگتی کہیے کہ 1967ء کی شکست کا احد کے میدان میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصان سے کیا تعلق؟ شہرانیوں اور نفع بازوں کا صدیقیوں اور شہیدوں سے کیا تعلق؟

صحابہ کرامؓ میں سے چند ایک کی غلطی کے نتیجے میں، ہونے والے نقصان کے بعد مسلمانوں نے سنبھلنے میں دیر نہ کی۔ انہوں نے دشمن کو فوراً پرے دھکیل دیا۔ انہوں نے اپنی ایک بالشت زمین بھی اپنے دشمنوں کے قبضے میں نہ جانے دی۔ ان مقدس ہستیوں کا کیا تعلق ان لوگوں سے جنہوں نے غفلت و حماقت سے اپنی ہر چیز گنوا دی۔ غفلت و حماقت کے سوا اور کیا سبب تھا؟

کچھ لوگوں نے ایک چھوٹے سے حکمران کو خوش کرنے کے لیے دین اسلام کو

دلدل میں گھسنے کی کوشش کی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مصر کی مسلح افواج کی حالت بہت خستہ و خراب تھی۔ کیوں کہ جان بوجھ کر فوج کو بہترین ساز و سامان اور بہتر تربیت سے محروم رکھا گیا تھا۔ اگر مصر کے تمام حالات کی آزادانہ تحقیق کی جائے تو معلوم ہو گا کہ مصر فوجی انقلاب کے ربع صدی بعد روحانی، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے لڑکھڑاہا تھا۔ اگر حالات نے ہماری سیاسی اور فوجی پسماندگی سے پردہ ہٹا دیا ہے تو یہ محض اتفاقات تھے۔ میری رائے میں ہم واپس الخدیوی اسماعیل کے دور میں پہنچ چکے ہیں۔ ہماری تہذیبی پسماندگی کو کثرتِ کبادی اور اشیائے خورد و نوش کے زیادہ استعمال کے پردوں سے چھپایا نہیں جاسکتا۔

میں نے دیکھا کہ مصریوں کا دینی شعور بلند ہے۔ وہ اسرائیل سے مصر کی شکست کو دین سے رد گردانی اور دین داروں پر ظلم و ستم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

صدر جمال نے اپنے دینی جذبہ کے اور اللہ کے ساتھ اپنی صلح کے اظہار کے لیے کیا کیا؟ اس نے آنحضرت ﷺ کے یومِ ولادت کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی پہلی محفل کا انتظار کیا۔ وہ مسجد الحسین میں منعقدہ محلِ میلاد میں شرکت کے لیے گیا۔ وہ نمازِ مغرب کے بعد وہاں پہنچا اور نمازِ عشاء سے پہلے اٹھ کر آگیا۔ اس نے اسلام سے اپنا تعلق بالکل توڑ لیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نتیجہ تھا ٹیڈ، سکارنو اور نرو جیسے لوگوں کے ساتھ اس کی دوستی کا۔ اس نے سمجھا کہ یہ حکمرانِ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہیں۔ اب اس بے چارے کے پاس نہ تو کوئی اعلیٰ تعلیم تھی نہ ہی وہ کسی مخصوص فلسفہ و فکر کا حامل تھا کہ ان کا مقابلہ کر سکتا۔ یہ اُن سے متاثر تھا۔ ان جیسا بننا چاہتا تھا لہذا اس نے دین سے دوری اور دین دشمنی اختیار کی۔ یہ بھی انہی کی طرح لحد بن کر ”عظیم تر“ بننے کا آرزو مند تھا۔ اس کی دین سے دوری کا ایک سبب علماءِ اہل حق کی خوشامد تھی جو دنیا کی طلب میں اس کو خوش کرنے اور اس کا تقرب پانے کی فکر میں تھے۔ اگر ان علماء میں سے کوئی ایک بھی خوفِ خدا رکھنے والا ہوتا تو شاید صدر ناصر کا سینہ

ایمان کی آگاہ بن جاتا۔

1967ء کی شکست کے بعد صدر جمال کے استعفیٰ کا ڈرامہ رچایا گیا۔ عوام نے مصری پارلیمنٹ کا یہ منظر دیکھا جب ایک رکن پارلیمنٹ صدر کے استعفیٰ واپس لینے کے لیے بڑے دلائل دے رہا تھا تو ایک دوسرے رکن پارلیمنٹ نے صدر سے استعفیٰ واپس لینے کی خاطر... اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا... رقص کرنے والا رکن پارلیمنٹ جب یہ حرکت کر رہا تھا اس وقت ہمارے ہزاروں فوجی دشمن کی قید میں تھے اور ابھی رہا نہیں ہوئے تھے۔ ہزاروں قتل ہو چکے تھے اور ہزاروں زخمی تھے، جس کی وجہ سے پوری مصری قوم کے گھر گھر صعب اندوہ و غم مچا ہوا تھا۔ یہ رکن پارلیمنٹ جو اپنے اور اپنے خاندان کے جذبات کا درست اظہار بھی نہ کر سکتا تھا اسے اور اسے جیسے بہت سے لوگوں کو ایک فرد واحد کے قائم کردہ نظام نے پوری قوم کے امور کی باگ ڈور دے دی تھی۔ یہ شخص اس لیے بنا رہا تھا کہ اس طرح وہ باقی رہے۔ اگر شریعت کی حکمرانی آجاتی تو اس شخص کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے پھر کاشت کاری یا کوئی اور پیشہ اختیار کرنا پڑتا۔

ظلم و استبداد بلکہ اندھے استبداد کو اپنے سارے کے لیے غیر طبعی افراد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مل کر لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کریں۔ ایک دوسرے کی خامیوں پر پردہ ڈالیں، ایک دوسرے کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں، غرض کہ قوم کے کاروان کو تباہی کے عمیق گڑھے تک لے جانے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

سچی بات یہ ہے کہ فوجی آمریت کے ان منحوس سالوں میں مردانگی، دیانت داری اور مہارت کو شکست ہوئی جب کہ دھوکہ، فریب اور استحصال میں ترقی ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمال عبدالناصر 1967ء میں ہی مر گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس دنیا سے دو سال بعد گیا تھا۔ بہر حال وہ عربوں کو ایسی ذلت سے دوچار کر گیا جس نے چروں پر سیاسی مل دی۔ وہ یہودیوں کو ایسی فتح سے ہم کنار کر گیا جس کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہ

دیکھا تھا۔ جمال مسلمانوں کو نہایت پے چیدہ مسائل و مشکلات میں ڈال گیا۔

## انور السادات کے ساتھ

میں ایک دن ائمہ مساجد کو تربیتی لیکچر دینے کے بعد وزارت اوقاف واپس آیا تاکہ اپنے ذمہ کے دفتری کام سرانجام دوں۔ وہاں انکوائری آفس کا ایک ملازم بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا اس نے کہا: وزیر صاحب نے آپ کا بہت انتظار کیا ہے تاکہ ان کے ساتھ صدر جمہوریہ سے ملنے جائیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ آٹنے کے فوراً بعد ان سے جا ملیں۔ وہ اور شیخ الازہر ایک وفد کی قیادت کریں گے جو صدر سے ملنے جا رہا ہے۔

یہ ملازم اخوانی تھا اور خیر کلبے حد متنی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات میں دلچسپی نہیں لے رہا تو اس نے مجھے قسم دے کر کہا کہ آپ ضرور جائیں۔ اس نے کارڈ رائیور کو حکم دیا کہ وہ مجھے فوراً لے جائے اور وفد سے جا ملائے۔

انور السادات، جمال عبدالناصر کے رفقاء میں برتر بہ تھا بلکہ شاید ان سب سے کم ہی تھا۔ مگر وہ اپنے رفقاء کے عزائم کے برعکس برسر اقتدار آگیا۔ اسے تقدیر کا کرشمہ ہی کہنا چاہیے۔ انہوں نے اسے بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اختیارات ان کے ہاتھوں میں رہیں گے اور وہ محض آئینی بلکہ کاغذی صدر ہوگا۔ یہ تھا بھی سچ کہ فوج ان کے ہاتھ میں تھی۔ پولیس، اطلاعات اور طاقت کے سب سرچشمے انہی کے قبضے میں تھے۔ جبکہ سادات ہر قوت و مدد سے محروم تھا، اس کے باوجود وہ سب ہار گئے اور اس نے ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی ان کا کاٹنا نکال دیا۔

اس کا سبب کیا تھا؟ کیا سادات کی ذہانت و فطانت؟ شاید کوئی ایسا سمجھتا ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اسے ہر توفیق سے محروم کر دیتا ہے۔ یوں اسے ہزیمت و شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صدر جمال کے رفقاء نے یہ سمجھ کر

ہڑتال کی کہ کاروبار مملکت رک جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہر چیز معمول کے مطابق ہوتی رہی۔ جیسے حضرت سلیمان کی وفات کے بعد جن انہیں زندہ سمجھ کر کام کرتے رہے اور زحمت کشی کرتے رہے۔

سادات نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اس نے ان لوگوں سے انتقام لینے والے کچھ افراد کے ساتھ ساز باز کی۔ اقتدار پر قابض ہو گیا۔ اس نے اپنے ان مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیا۔ جہاں اخوان المسلمون پہلے ہی موجود تھے۔ یہ ایک عجیب عبرت ناک منظر تھا کہ کل تک جو لوگ اخوان المسلمون پر ظلم ڈھارہے تھے وہ آج ان کے ساتھ سزا بھگت رہے تھے۔ سادات نے اقتدار پر اپنی گرفت مکمل کر لی تو اس کی تائید و حمایت کے لئے وفد آنے لگے۔ ہائے زندگی کی بے وقعتی اور انسان کی بے ثباتی۔

خیر وزارت اوقاف کی کار نے مجھے جلد، ازھر کے وفد سے جا ملایا۔ اس وفد کی قیادت شیخ محمد الحام کر رہے تھے، جب کہ اوقاف کے وفد کی سربراہی ڈاکٹر عبدالعزیز کر رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ سادات نے نہایت گرجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ سابقہ برسر اقتدار ٹولہ... جس سے ہر کوئی متنفر تھا... رخصت ہو چکا تھا۔ اب نیا صدر، جامع تبدیلی چاہتا تھا۔ اُس سے خیر ہی کی توقع کی جا رہی تھی۔

میں جسمانی طور پر تو وہاں موجود تھا لیکن میں ذہنی طور پر کئی برسوں پر محیط یادوں میں گم تھا۔ صدر سادات کی بجوں ہی مجھ پر نگاہ پڑی، بڑے احترام سے سلام کیا اور خیریت و عافیت دریافت کی۔ پوچھا۔ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟ شرکاء وفد نے جب صدر کا میرے ساتھ یہ غیر معمولی التفات دیکھا تو وہ میرا کچھ زیادہ ہی احترام کرنے لگے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز نے صدر سادات سے کہا کہ مجھے (شیخ غزالی کو) وزارت اوقاف کے سیکرٹری کا اضافی چارج بھی دے دیا جائے۔

میں نے اپنی نئی ذمہ داری کو بھی پوری امانت داری اور دیانت داری سے ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نیز میں نے صدر کی اس مہربانی پر ان کی تعریف کرنے اور ان کا علانیہ شکریہ ادا کرنے کا تہیہ کیا۔

## دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت

وزارت اوقاف میں دعوت و تبلیغ کے لیے کی گئی کوششیں لائق تحسین ہیں۔ اس میں ہمیں کئی اطراف سے تعاون ملا۔ ایک خاص عمارت میں بیسیوں ائمہ مساجد اکٹھے ہوتے، جہاں پر انہیں ان علوم پر لیکچر دیئے جاتے جن کی وہ الاذہر میں تکمیل نہ کر سکے تھے۔ بڑے بڑے مفکرین انہیں اپنے اعلیٰ تجربات سے آگاہ کرتے۔ ائمہ حضرات اس تربیتی دورانیہ میں علمی امور میں منہمک رہتے۔ کورس ختم کرنے کے بعد، اپنے مستقبل کے لیے بہترین علمی مواد لیے واپس اپنی ملازمتوں کے مقامات پر چلے جاتے۔

ایک اور علمی سرگرمی بھی تھی۔ ہر سال کچھ منتخب کتابوں کا جائزہ لیا جاتا۔ جن کتابوں کے قارئین کا دائرہ وسیع ہوتا، جن کے مطالعہ سے عمل میں مہارت کا اضافہ ہوتا۔ ان کی معلومات کا جائزہ لینے کے بعد مقابلہ میں بہترین قرار دی جانے والی کتابوں کے مصنفین کو انعامات دیئے جاتے۔

ہم نے دعوت و تبلیغ کے لیے صوبوں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ہر ماہ داعیوں اور مبلغوں کا اجلاس بلا تے اور دعوت و تبلیغ کو بہترین انداز میں پیش کرنے کے لیے غور و فکر سے کام لیتے۔

ہم نے ہر مسجد کے ساتھ ایک مناسب لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ معلومات تک رسائی اور علم تک دسترس آسان ہو سکے۔

دعوت و تبلیغ کے اس کام میں حق پرست مخلصین نے ہمارے ساتھ بہت تعاون



کیا۔ بھاری بھر کم شخصیتیں رعب دار تو بہت ہوتی ہیں مگر یہ کھوکھلی ہستیاں عموماً غیر مفید ہوتی ہیں۔ یہ حقائق کو مسح کرتی ہیں جب کہ اہل صدق و صفا بہت کم مگر نہایت مفید ہوتے ہیں۔

## بیورو کریٹ کارویہ اور میری حق گوئی

مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دن سیکریٹری وزارت اوقاف نے مجھے خان دانی منصوبہ بندی کے حق میں ایک شان دار تقریر تیار کرنے کا کام سونپا اور یاد دلایا کہ خان دانی منصوبہ بندی کا پراجیکٹ ناکام ہونے والا ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”کثرت آبادی کے مسئلے سے پوری دنیا دوچار ہے۔ یہ صرف مسلمانوں سے حل نہ ہو سکے گا۔“ انہوں نے کہا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”غیر مسلموں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعداد بڑھائیں۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ اپنی آبادی کم کریں۔ میں تو مسلمانوں کو کم کرنے کے منصوبے پر کام نہیں کروں گا۔“ انہوں نے ترش رو ہو کر کہا۔ ”آپ ملازم ہیں۔ سینئر کا حکم بھی کچھ مقام رکھتا ہے لہذا اس کی تعمیل ہونی چاہیے۔“ میں نے پورے وقار کے ساتھ کہا۔ ”میں کسی کا گھریلو ملازم نہیں ہوں۔ میں اور سینئر، ہم سب ایک اسلامی ڈھانچہ میں ملازم ہیں۔ ہم سب کا مقصود اللہ ہے۔ میں کسی بھی انسان سے پہلے اللہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں اور صدر مملکت ایک برتن... یعنی مسلمانوں کے مال سے... تنخواہ لیتے ہیں۔ میں کسی کی جیب سے تنخواہ نہیں لیتا کہ میں اللہ کے جائے اس کی طرف داری کروں۔“

سیکریٹری صاحب نے منہ پھیر لیا اور غصے سے چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور کہا۔ ”جناب من! تقریر کسی صاحب نے لکھ دی ہے۔ میں نے کہا، جس کی مرضی ہے جو چاہے لکھے۔ مگر میں کسی کے لیے اپنا دین بچنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

مجھے ان علماء سے نفرت ہے جو اپنے جاہلانہ فتوؤں سے حکم رانوں کو خوش کرتے

ہیں یہ حضرات، قاہرہ بلکہ ہر دار الحکومت میں اپنے ایمان و ضمیر کو لیے، یوں پھر رہے ہوتے ہیں جیسے ٹیکسی ڈرائیور اپنی کاریں لیے پھرتے ہیں اور سواری کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان نام نہاد علماء کو ان کے فتاویٰ قبول کرنے والوں کو اور ان کو ذمہ داری سونپنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔

## عظمتِ کردار

ایک دن میرا ایک انتہائی بے تکلف زندہ دل دوست مجھے ملے کیا آتے ہی کہنے لگا۔ ”آپ تو اپنے عمل بد کے شکنجے میں آگئے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر عبدالحمید محمود کو وزیرِ اوقاف مقرر کر دیا گیا ہے؟“ میں نے کہا۔ اس میں کیا ہرج ہے؟ کہنے لگا۔ ”کیا آپ نے رسالہ ”لواء الاسلام“ میں موصوف کی بیان کردہ ایک حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی غلطیوں کی نشاندہی نہیں کی تھی؟“ میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں... اگر کوئی شخص، میری کسی غلطی کی تصحیح اچھی نیت سے کرتا ہے تو مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ دوست کہنے لگا۔ ”اچھا، ہم دیکھیں گے۔ آپ کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟“

ڈاکٹر عبدالحمید نے وزارتِ اوقاف کا چارج لیا تو میں ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہونے میں متردد تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں مجھے کچھ نقصان نہ پہنچے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک قاصد آیا جس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں گیا تو وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میں وزارتِ اوقاف میں اپنے کام کی ابتدا اللہ کی کتاب کی خدمت سے کروں۔ میں ازھر کے طلبہ کے مابین ایک مقابلہ کا اعلان کرتا ہوں۔ قرآن شریف حفظ کرنے والوں کو گراں قدر انعامات دیئے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں وزارتِ اوقاف کی طرف سے ایک آرڈی ننس جاری کیا جائے۔“ میں نے ان کے اس اقدام کو سراہا اور جو وہ چاہتے تھے، اس کا مسودہ تیار کر

دیا۔ اس مرد صالح نے اپنے سرکاری امور کا آغاز، مسلمانوں کے لیے اس کارِ خیر سے کیا۔ میرے ان کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات رہے۔ میری علمی تصحیح پر ان کا کبیدہ خاطر ہوتا، میرے دوست کی دل لگی تک ہی رہا۔ اعلیٰ اخلاق کے حامل افراد سے اس کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ علمی اختلاف پر، اپنے دل میں بغض و کینہ رکھیں گے اور نقصان پہنچانے کا سوچیں گے۔

## مسجد عمرو بن العاص کی آباد کاری

کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالخلیم نے مجھے بلا بھیجا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مسجد عمرو بن العاص میں جمعہ پڑھانے کے لیے، ان کی بھی انتخاب مجھ پر پڑی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ ”یہ مسجد نہیں رہی۔ اس کے نشانات مٹ چکے ہیں، کچھ مدھم پڑ گئے ہیں۔ یہ تو اب محض پرانی دیواروں کے مابین ایک کھلی فضا بن چکی ہے۔ اس کا صحن پانی کی گزرگاہ ہے۔ کہنے لگے۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو چنا ہے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہ میں ایک بار پھر ازھر میں جمعہ کا خطبہ دینے لگوں؟ میں کئی سالوں تک رضا کارانہ طور پر یہ خدمت سرانجام دیتا رہا ہوں۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”آج بدھ ہے، انشاء اللہ، ہم پرسوں مسجد عمرو بن العاص میں آپ کے پیچھے نماز جمعہ پڑھیں گے۔ آپ تیاری کیجئے۔“

جمعہ کا دن آیا۔ میں جلدی مسجد چلا گیا تاکہ نماز کے لیے جگہ کی تیاری کی نگرانی کروں۔ مسجد کے ارد گرد کوڑا کرکٹ کے ڈھیر، زمین سے چھت تک پہنچے ہوئے تھے۔ مسجد کے قریب ہی اینٹوں کے بھٹے تھے جہاں سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل مسجد کو گھیرے ہوئے تھے۔ مسجد کا صحن کسی صحرا کا قطعہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ پرچ اور ٹیڑھا میڑھا تھا۔ میں نے مسجد کے اس صحن کو دیکھ کر کہا۔ میں یہاں کیا کروں گا؟ جہاں ہوائیں آوارہ پھرتی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ یہاں نماز جمعہ پڑھی اور معمول کی تقریر

کی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لیے دعائے خیر کی۔ اب ہم نے خوب محنت کی۔ مسجد میں حاضرین کی تعداد میں ہدیہ اضافہ ہونے لگا۔ پہلے لوگ پیسیوں تھے... کچھ فقہی مذاہب میں اس کی تعداد کے ساتھ نماز جمعہ درست نہیں ہوتی... تو پھر سینکڑوں ہو گئے۔ پھر ہزاروں تک نومت جا پہنچی۔ وزارت داخلہ کے اعداد و شمار کے مطابق ایک جمعہ کی نماز میں نمازیوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

نمازیوں کی اتنی بڑی تعداد کاراز یہ تھا کہ میں نے جس موضوع پر خطاب کرنا ہوتا تھا، اس میں دلچسپی لیتا، توجہ و اہتمام سے تیاری کرتا اور موضوع کا حق ادا کرتا۔ مناسب حالات و واقعات کا موقع و محل کے مطابق تجزیہ کرنے کے علاوہ میں قرآن کریم کی موضوعی تفسیر بیان کرتا۔ میں نے یہ تفسیر پیش کرنے کا طریقہ بزرگ عالم دین ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز کی پیروی میں اختیار کیا۔ جو انہوں نے اپنی کتاب ”النباء العظیم“ میں بیان کیا ہے۔

گہنی بات یہ ہے کہ نمازی ان خطبوں کو ناپسند کرتے ہیں، جن میں کانوں میں صرف خالی آواز پڑتی رہتی ہے۔ یا جن خطبوں میں صرف معمولی سیاسی موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔

میں اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتا رہا۔ یہ اضافہ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں تدبر و تفکر کے ذریعے کیا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط رکھنے سے بھی اس میں مدد ملی۔ میرا خطبہ جمعہ، اللہ کے ذکر اور اس کے احکام کے احیاء پر مشتمل ہوتا تھا۔

مسجد عمرو بن العاصؓ کو آباد اور اس کی از سر نو مرمت کا سہرا جس شخص کے سر پہنچتا ہے وہ ہے مسٹر حمدی عاشور۔ آپ نے مسجد کے ارد گرد کے میدان کو صاف کرنے کا حکم دیا۔ اینٹوں کے بھٹے جن سے دھواں پھیلتا تھا، وہاں سے ہٹوائے۔ کوڑا کرکٹ اٹھوانے کے لئے حکم دیا۔ چنانچہ تقریباً ایک ہزار چھکڑے بھر کر وہاں سے اسے ہٹا دیا گیا۔ از سر نو تعمیر و مرمت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس تمام کارگزاری کے نتیجے میں مسجد از سر نو مسلمانوں

کی آنا جگہ بن گئی۔ ہر طرف سے لوگوں نے اس کا رخ کیا۔ مسجد نے ایک تعلیمی ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں اساتذہ اور طلبہ درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ مصر کے شمالی اور جنوبی علاقوں کے لوگ یہاں عبادت کے لیے جمع ہونے لگے۔ مسٹر حمدی عاشور قاہرہ کے ڈپٹی کمشنر تھے مگر ان کے اسی دینی جذبہ کی وجہ سے، انہیں جلد ہی اس منصب سے ہٹا دیا گیا۔

## سیکریٹری وزارت اوقاف کے منصب پر تعین اور دو دنوں کے بعد استعفیٰ

محکمہ اوقاف کی ملازمت کے میرے آخری دنوں میں پروفیسر ڈاکٹر زکریا البری نے میری ناقدری کا ازالہ کرنے کے لئے، یہ تجویز پیش کی کہ مجھے وزارت اوقاف کا سیکریٹری بنا دیا جائے۔ انہوں نے صدر انور السادات کو بھی اس پر رضامند کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عہدے خیر و بھلائی اور فلاح و بہبود کے کام کرنے کے لئے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔ عہدہ جتنا بڑا ہو، اتنا ہی زیادہ قوم کی خدمت اور نفع رسانی کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ یہ عہدہ کون سا ہو؟ عہدہ کوئی بھی ہو میں اسے اُس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے وہ قائم کیا گیا ہے۔ عہدے اور منصب صرف رفاہ عامہ کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا: آپ کی محبت و ہم دردی اور آپ کی حمایت و خیر خواہی کس کے لئے ہو گی؟

میں: اللہ کے لیے، اللہ کی خاطر

وہ: اگر آپ کو حکمرانوں کی تعریف کرنے اور ان کی پالیسیوں کو جائز و حق جاننا

ثمت کرنے کے لیے کہا گیا تو پھر؟

میں: ایسا کرنا میرے شلیانِ شان نہیں ہے۔ میں صرف اسلام کے لئے کام کروں

گا۔

وہ: آپ سادات کو جانتے ہیں اور اس کی پالیسی پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔  
میں: میں اپنی اس روش کو تبدیل نہیں کروں گا۔  
چنانچہ یہ صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔

مگر میں نے جب اپنا یہ نیا عہدہ سنبھالا تو معاملہ میرے تصور کے قطعا برعکس نکلا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ مجھے کچھ عرصہ بعد اس منصب سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مگر یہاں تو بہت جلد ہوا۔ مجھے ایک ایسی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا کہ میں نے اپنا منصب ترک کرنے ہی میں عافیت سمجھی حالانکہ میں چاہتا تھا کہ اس منصب پر قائم رہ کر اپنے رب اور اپنے دین کی کچھ خدمت کر سکوں۔ مگر میں نے صرف دو دن کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ یعنی وہی بات کہ آئے بھی نہ تھے کہ نکالے بھی گئے۔ مگر میں تو خود ہی نکلا تھا۔

ہمارے حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کسی کو منصب پر فائز کرنے کے بعد اسے خرید لیا ہے۔ میں نے سرکاری دینی اداروں کے عہدوں پر فائز شخصیات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ جس شخص نے ان حضرات کو یہ مناصب سونپے ہیں وہ دین اسلام کو مصائب و آلام میں مبتلا کرنے کے فن کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ ہی عرصہ بعد پوری اسلامی سرگرمیوں کو ایک زبردست طوفان مخالف کا سامنا کرنا پڑے گا جو انہیں بتر بتر کر دے گا۔

## صدر سادات کی ملت فروشی

ایک ماہر سیاسیات نے مجھ سے کہا۔ دینی حلقوں میں تباہی کا آنا لازمی تھا۔ اس لیے کہ صدر سادات امریکہ کے دورے پر گیا تو واپسی پر وہ کچھ اور تھا۔ میں نے کہا: کیسے؟ کہنے لگا: یہودی چاہتے ہیں کہ مصر اور اسرائیل کے مابین دوستانہ تعلقات ہوں دشمنی ہو نہ

عداوت۔ یہودیوں کی اس خواہش کا مطلب یہ ہے کہ دینی و تاریخی مفاہیم میں تبدیلی کی جائے۔ سماجی و اقتصادی صورتِ حال کو بدلا جائے۔

مصر میں جب تک اسلامی لہر مضبوط ہے، اسلامی جذبہ مائل بہ عروج ہے اور مصر کے معاملات میں موثر کردار ادا کر رہا ہے، اس وقت تک کیمپ ڈیوڈ معاہدہ..... جس نے مصر کو عربوں سے الگ تھلگ کر دیا ہے... ناکام ہے۔ اور اس کی ناکامی کے بعد سادات کے دن گنے جا چکے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ انور السادات، اخوان المسلمون پر اور اسلامی جماعتوں پر ستم توڑ کر اور ان پر عرصہ حیات تنگ کر کے، اپنے آپ کو مستحکم کرنے اور اپنے آپ کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کو یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ وہ ان کے لیے قابلِ اعتماد ہے۔ وہ یہی تاثر دینے کے لیے بار بار اعلان کرتا رہتا ہے کہ سب کچھ میں ہی ہوں۔ تمہا میں۔ میں تمہیں حکمرانوں کا احترام کرنا سکھاؤں گا۔

سادات نے ایک اخوانی رہنما کی گرفتاری کے بعد قسم اٹھا کر کہا تھا کہ اللہ کی قسم! میں اس پر رحم نہیں کروں گا۔ ایک عالمِ دین نے اپنی تنقید سے سادات کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ ان کو جیل میں ڈالنے کا حکم دینے کے بعد سادات نے کہا تھا، اسے جیل میں کتے کی طرح پڑا رہنے دو۔

کہا جاتا ہے کہ رزق کا طلب گار کسی قانون و اصول کی پروا نہیں کیا کرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ طالبِ جاہ و اقتدار کا بھی یہی حال ہوتا ہے وہ طلبِ جاہ میں عقل و ہوش، اخلاق و کردار اور دین و مذہب سبھی کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

خادمانِ اسلام پر یہ سب ظلم و ستم اس لیے روا رکھا جا رہا ہے کہ وہ یہودیوں کے ساتھ صلح کرنے کے خلاف ہیں۔ اس المیہ میں طرفہ تماشایہ ہے کہ خادمانِ اسلام پر، عوام اور قوم کے مفادات کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ کون سے عوام؟ اور کون سی قوم؟ شاید یہودی عوام اور بنی اسرائیل کی قوم مراد ہے۔

سادات کا جرم یہ ہے کہ اس نے مصر میں انتظامی نگرانی کا ڈھانچہ تباہ کر دیا اور مالی بے قاعدگیوں سے چشم پوشی کر لی۔ اُس نے ”دی ری رسوم“ کے زیر عنوان، رقص و سرود کی ایسی محفلیں منعقد کیں جن میں بہت حوا کی بے حرمتی ہوتی ہے اور شہری و دیہاتی قدروں کو توڑا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ اس کی بیوی مالٹا کے رہنے والے ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ جو کچھ عرصہ پہلے ترک وطن کر کے مصر میں کباد ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اہلیہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ مگر مجھے اس میں شک ہے۔

سادات ایک عجیب و غریب شخص ہے۔ ہم اس کا حساب کتاب، اللہ پر چھوڑتے

ہیں۔

www.KitaboSunnat.com



# شیخ محمد الغزالی کی تصنیفات کا مختصر تعارف

۱۔ الاسلام و الاوضاع الاقتصادية: اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن 1987ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔ یہ کتاب 214 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1947ء میں نکلا۔ یہ شیخ کی پہلی کتاب ہے۔ ساتویں ایڈیشن کے دیباچہ میں مولف نے اعتراف کیا ہے کہ کتاب میں کئی فروگزاشتیں ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بہت سے مقامات وضاحت کے محتاج ہیں۔ کئی آراء اور اجتہادات میں جدید حقائق کے ظہور کی وجہ سے تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مولف نے اپنے اس دیباچہ میں گزشتہ دہائیوں کے تجربات کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ الاسلام و المناهج الاشتراكية: یہ کتاب 270 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے اصل منابع کی طرف رجوع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ سائنس کے بارے میں اسلام کے موقف کی ترجمانی کی ہے۔ اسلام کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام کو واضح کیا ہے۔ جدید نقطہ ہائے نظر کے متعلق اسلامی موقف بیان کیا ہے۔ اسلام اور کمیونزم کے مابین کشمکش اور تصادم کو بھرپور اسلوب میں نمایاں کیا ہے۔

### ۳۔ الاسلام المفتری علیہ بین الشیوعیین

والراسمالیین: 187 صفحات پر محیط اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1950ء میں قاہرہ سے نکلا۔ اس کتاب کے مضامین پہلے ایک دینی رسالہ میں شائع ہوتے رہے۔ کتاب میں سفید اور سرخ سامراج کے زیر اقتدار علاقوں میں انسانوں پر ڈھائے جانے والے اقتصادی مظالم کو واضح کیا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور کیونززم دونوں کی خرابیاں گنوائی ہیں۔

### ۴۔ الاسلام والاستبداد السیاسی: اس کتاب کے 227

صفحات ہیں۔ یہ اصل میں وہ لیکچرز ہیں جو شیخ الغزالی نے طور جیل میں 1951ء میں دیئے تھے اور بعد میں کئی رسالوں میں چھپے تھے۔ اس میں جاگیر داری، ڈکٹیٹر شپ اور ایک فرد کی حکمرانی پر تنقید کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ اسلام میں ان کی گنجائش نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات شوریٰ اور اجتماعی رائے کی دعوت دیتی ہیں۔ کتاب کے اہم عنوانات یہ ہیں۔ شوریٰ، جماد، غلامی جاہلیت میں، موجودہ مسائل، اسلامی مسائل۔

### ۵۔ من ہنا نعلم: یہ کتاب 243 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شیخ غزالی نے

استاد خالد محمد کی کتاب ”من ہنا نبدا“ کا رد کیا ہے۔ ان کی غلطیوں اور کج فہمیوں کو واضح کیا ہے۔ اسلام اور مملکت کے باہمی اثوث تعلق پر زور دیا ہے۔ یہ محض تنقید ہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات و اقدار کا دفاع بھی ہے۔ شیخ غزالی نے اگرچہ اس کتاب میں شیخ خالد پر زبردست تنقید کی ہے مگر ان کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ الا زہر کے اس فتویٰ کو بھی آپ نے ماننے سے انکار کر دیا تھا جس میں شیخ غزالی کی ڈگری کو منسوخ کیا گیا تھا۔ شرعی

حدود و لو رکن کے قیام کے بارے میں شکوک و شبہات کا ازالہ، دین کو مملکت سے جدا کرنے کی بدعت، عورت کے سماجی کردار، کمانت اور اسلام، جمہوریت، خاندانی منصوبہ بندی، عربی قومیت اور اسلام، اس کتاب کے خاص موضوعات ہیں۔

## ۶۔ تاملات فی الدین والحیاء: اس کتاب کے 257 صفحے ہیں۔ یہ

مختلف مضامین، مقالات اور تحقیقات و نظریات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین مجلۃ الاخوان المسلمین کے لئے تحریر کئے گئے تھے۔ اس کتاب میں شیخ نے اپنی دلچسپیوں کو نہایت موثر اسلوب میں بیان کیا ہے۔ مسلم عوام کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے۔ اپنی ماضی کی یادوں کی دلکش انداز میں تصویر کشی کی ہے۔

## ۷۔ عقیدۃ المسلم: اس کے 262 صفحے ہیں۔ اسلامی عقائد اس کتاب کا

موضوع ہیں۔ یہ فلسفیوں اور متکلموں کی کتابوں سے اس لیے ممتاز ہے کہ اس میں عقل و قلب کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جذبات اور فکر سے اپیل کی گئی ہے۔ نفسیاتی رجحانات اور ذہنی قوتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقائد جیسے بظاہر خشک موضوع کو مولف نے بڑی نرمی اور سوز و گداز سے ہد کش بنادیا ہے۔ کتاب وسنت کی نصوص سے استدلال کیا ہے ورنہ عام طور پر علم الکلام کی اہمات الکتاب میں بہت کم ہی کوئی آیت یا حدیث نظر آتی ہے۔ کتاب کے عنوانات ہیں: حقیقتِ اولیٰ، وحدتِ مطلقہ، کمالِ اعلیٰ، قضاء و قدر، عمل اساسِ ایمان، گناہ اور توبہ، نبوت، خلود۔

## ۸۔ خلق المسلم: 248 صفحوں پر مشتمل اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل

چکے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کی توجہ قرآن وسنت کی ان تعلیمات کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جن کو اپنا کر وہ اپنے دین، دنیا اور آخرت کو سنوار سکتے ہیں۔ مولف نے اس دور میں

مسلمانوں کی اخلاقی بے راہ روی کی بھی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے مسلمان پستی اور زوال کا شکار ہیں۔ کتاب کے عنوانات یہ ہیں: ارکان اسلام اور مہادی اخلاق، افضل دنیا کی طرف، انسان خیر و شر کے مابین، اخلاقی جرائم پر حدود، اخلاق محیط کل، صداقت، امانت..... میانہ روی اور پاک دامنی، نظافت، جمالیات اور صفات، دوستوں کا انتخاب، علم و عقل، وقت سے استفادہ، زمانہ سے عبرت۔

## ۹۔ التعصب و التسامح بین المسیحیۃ

### والاسلام: دحض شبہات ورد مفتریات:

366 صفحات کی اس کتاب میں ایک مسیحی ذمہ دار شخص کے ان اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے جو اس نے اسلام پر کئے تھے۔ شیخ غزالی نے پوری کتاب میں مسیحی معترض کا نام نہیں لیا تاکہ وہ گناہ کی موت مرے۔ کتاب کے اہم موضوعات یہ ہیں۔ مسلمان اور اہل ذمہ، مصر میں مسیحیت کی آمد، اسلام تعصب اور رواداری کے مابین، مستشرقین کے بے حیاد الزامات اسلام پر، اسلام کا دوسرے مذاہب کے ساتھ طرز عمل۔

### ۱۰۔ فقہ السیرۃ: 498 صفحات کی یہ کتاب زیادہ تر مسجد نبوی اور روضہ شریفہ

میں لکھی گئی۔ اس کا کچھ حصہ حرم کے سامنے مکہ میں تحریر ہوا۔ مولف نے اس کتاب میں قرآن شریف، صحیح سنت اور عقل مستقیم پر انحصار کیا ہے۔ آپ نے شیخ ناصر الدین البانی کو، اس کتاب میں مندرج احادیث کی تحقیق کرنے کے لئے کلماتوں نے کئی احادیث کو ضعیف ٹھہرایا تو شیخ غزالی نے ان کا شکریہ ادا کیا، ان کی تحقیق کو سر اہل اور ان احادیث کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ مولف نے جدید مورخین اور قدیم مؤلفین دونوں کے اسلوب کو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی اس کتاب سے ایمان میں اضافہ، اخلاق

میں تہذیب اور جدوجہد میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔

آپ نے سیرت کو ایسے انداز میں لکھا ہے جیسے ایک سپاہی اپنے کمانڈر کے بارے میں یا ایک شاگرد اپنے استاد کے بارے میں لکھتا ہے۔ کتاب کے نو ابواب ہیں۔ پیغام اور امام، ولادت سے بعثت تک، جہاد و موت، عام ہجرت، نئے سلج کی عمارت کی بیلیویں، خونین جدوجہد، نیا انداز، اہمات المؤمنین، رفیق اعلیٰ۔

## ۱۱۔ فی موبک الدعوة: 262 صفحات کی اس کتاب میں شیخ غزالی نے

داعیوں اور مبلغوں کے جذبات کو معجزو لہ ہے۔ ان کی عمتوں کو انگیز کیا ہے۔ ان کے حالات کی اصلاح کی ہے اور بددلی کے خلاف جنگ کی ہے۔ شیخ نے یہ کتاب زندگی کے بارے میں اپنے کسی مخصوص نقطہ نظر کے اظہار کے لئے نہیں لکھی بلکہ تبلیغ اسلام میں، آپ کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، ان کے متعلق اسلام کی رائے پیش کرنے کے لیے لکھی ہے۔ میدان دعوت میں کچھ قائدین کی پسمانی نے شیخ کو متکین کر دیا تھا۔ آپ نے اس دکھ کا اظہار کیا ہے، اس لیے کہ قائدین کی لغزش، اسلامی قوتوں کے قدم ڈگمگا رہی ہے۔ یہ کتاب، اسلام محاذ کی داخلی پالیسی پر تنقید ہے۔ اس پالیسی نے دھوکہ بازوں اور منافقوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

## ۱۲۔ ظلام من الغرب: بار بار چھپنے والی 343 صفحوں کی یہ کتاب در حقیقت

”مصری مستشرقین“ کے رد میں ہے۔ جو پیدا تو ہوئے مصر میں مگر ان کی عقلیں مغرب میں پروان چڑھیں۔ یہ لوگ عربیت اور اسلام کے منکر اور مغرب کے نمائندے اور سفیر ہیں۔ کتاب کا مقصد اس قسم کے مستشرقین کو نمایاں کرنا اور انہیں پبلک لائف سے ہٹانا ہے۔ مولف نے عقلی تحریکوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان لوگوں کے عقلی بگاڑ یا ضمیروں کے فساد سے پردہ ہٹا کر بتایا ہے کہ یہ لوگ دین اسلام کے مستقبل کو تارک کرنے کے لئے

کیا کچھ حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ جاہلیت جدید کس طرح ہمارے دین اور ہماری امت کو چٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کتاب کے اہم عنوانات یہ ہیں۔

عقل اور جذبات، عرب ازم اور اسلام، حملہ آور تحریکیں، قانون سازی کے میدان میں، جدید جاہلیت، کیسے اخلاق کی حفاظت کی جائے؟، اقوام ترقی اور فناء کے مابین، اسلامی اتحاد کی جانب، اسلام اور جدید تمدن۔

### ۱۳۔ جدد حیاتک: 232 صفحات کی یہ کتاب، اس شخص کے لیے رہنمائی کی

بہترین کوشش ہے جو اپنی زندگی کا نیا صفحہ پلٹنا چاہتا ہے۔ اس کتاب میں اسلامی تعلیمات کا موازنہ مغربی اخلاق سے کیا گیا ہے۔ ذیل کاریگی کی کتاب ”پریشان ہونا چھوڑیے اور زندگی کا آغاز کیجئے“ کو اسلام اصولوں پر پرکھا ہے۔ یہ نہایت دلچسپ کتاب ہے جس میں فطرت سلیمہ اور وحی کی روشنی کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔

اپنے دین کی حدود میں جینو، پریشانی کے اسباب کا ازالہ کیسے؟، فراغت کا مصروف کیا ہے؟ نقصان پر نہ رو، کسی کے شکریہ کا انتظار مت کرو، روحانیت رسول ﷺ۔ آپ پر تنقید، آپ کی حیثیت کے مطابق ہی ہوتی ہے، اپنے آپ کا محاسبہ کرو۔

### ۱۴۔ لیس من الاسلام: صفحات: 262 اس کا چھٹا ایڈیشن 1991ء میں

قاہرہ سے نکلا۔ اس کتاب میں مولف نے اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کے ضروری اصول و فروغ سے عام مسلمان کو باخبر کریں۔ آپ نے فنی اصطلاحات اور مشکل زبان کے استعمال سے گریز کیا ہے تاکہ کتاب عام فہم رہے۔ مولف چاہتے ہیں کہ مسلم عوام اپنے دین کی بنیادی اور ضروری تعلیمات سے ضرور آگاہ ہوں۔ حصول علم دین میں ان کی رکاوٹیں دور ہوں۔ فنی تعلیم متخصص حضرات تک رہتی ہے اس لیے وہ امت کے لیے اتنی مفید نہیں

ہے۔ لیکن دینی تعلیم کا عام ہونا سنت کے لیے یکسر منافع بخش ہے۔ اسلامی عقل کو بیدار کرنے کے لیے جو جہاد مسلم قائدین نے شروع کیا تھا یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولف نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ دین کی حقیقت سے بے بہرہ لوگ، کتاب ہذا کی اشاعت پر سب سے پہلے ہوں گے۔ کتاب کے زیادہ اہم عنوانات یہ ہیں۔ شریعت اسلام اہداف و مناج، دین میں اختراع، فکر اسلامی کے بارے میں، عقائد کی بدعات، وحدت الوجود، قومی کشش، عبادات کی بدعات، عادات کی بدعات۔

**۱۵۔ الثقافة الاسلامیة:** یہ کتاب شیخ محمد غزالی نے پروفیسر عبدالرحمن صبیحہ المیدانی کے ساتھ مل کر لکھی۔ اسے جامعہ الملک عبدالعزیز نے 1980ء میں شائع کیا ہے۔ یہ یونیورسٹی کی مطبوعہ کتابوں کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسلامی ثقافت کے درسی مواد میں شامل ہے۔ اس کے عنوانات ہیں۔ عقیدہ، عبادت، اخلاق، قرآن، سنت، حدیث، اجتماع اور اجتہاد۔

## ۱۶۔ من معالم الحق فی کفاحنا الاسلامی

**الحديث:** اس کتاب کے صفحات کی تعداد 200 ہے۔ مولف کی رائے میں پچھلے زمانوں اور اس دور میں جو کچھ نقصان اسلام کو پہنچا ہے۔ اس کے متعلق اسلام کے دشمنوں سے کم اور اسلام کے فرزندوں سے زیادہ پوچھا جائے گا، اس لیے کہ بے علمی، افراط و تفریط، بے جاد غل اندازی اور اغراض و شہوات کی تسکین کے نتیجے میں نصرت الہی نہیں ملا کرتی۔ بالخصوص جب یہ بدایاں ہمارے اندر بہت پائی جائیں اور ہمارے دشمن چاک و چومند ہوں۔ شیخ غزالی صرف اپنی قوم پر ہی تنقید نہیں کرتے بلکہ خود اپنی کوتاہی کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دین کے لیے کام کرنے والوں میں پھیلنے والی غلطیوں کو واضح محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کرنے میں وہ کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیں گے۔

## ۷۔ ا۔ کیف نفہم الاسلام: اس کے 218 صفحے ہیں۔ اس کتاب میں ان

صحیح اسلامی معارف کو واضح کیا گیا ہے جن سے امت غافل ہے یا بہت کم لوگ اُن سے واقف ہیں حالانکہ ان حقائق سے عوام کا متعارف ہونا ضروری ہے۔ عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں پائے جانے والی علمی، اخلاقی اور عقائدی خرافات کو ختم کرنے کی اس کتاب میں بہترین کوشش کی گئی ہے۔ ان خرافات کا مسلمانوں میں وجود نہایت ضرر رساں ہے۔ ان خرافات کو مٹا کر ان کی جگہ اصل اسلامی روایات کو لانا ایک کٹھن کام ہے۔ مسلمان اُن سے بدکتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان غیر شرعی رسوم و رواج پر عمل کرتے ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان بدعات و رسوم کے خلاف لب کشائی کی جسارت کرتا ہے تو اس کے خلاف ایسا اودھم مچتا ہے گویا اُس نے جاہلیت و جہالت کو محو کرنے کی کوشش کی ہے۔

اہم عنوانات: اسلام کی تعریف، مذہبی تعلیم دینے میں پائی جانے والی خرابیاں، زندگی کے علوم اور اُن کی ترقی، دنیا سے ناواقفیت اور دنیا داری، علم اور حکومت کے مابین تاریخی جدائی، عقیدہ الہی تعلق اور انسانی منہج، تجدید و اجتہاد، سخت کے دائرے میں۔ میں کیوں مسلمان ہوں؟

## ۱۸۔ الاستعمار احقاد و اطماع: یہ کتاب 268 صفحات پر

مشتمل ہے۔ کتاب کا موضوع اسلام کے سب سے بڑے دشمن اور مخالف ہیں۔ اُن کے حسد، کینہ اور بغض سے پردہ اٹھایا ہے۔ سامراج کی ریشہ دوانیوں اور مخالف اسلام کر تو توں کو نمایاں کیا ہے۔ مسلم ممالک پر سامراج نے جو ثقافتی یلغار کی ہے اس کے نتیجے میں اخلاقی، ثقافتی اور قانون سازی کے میدانوں میں جو ارتداد پھیلا ہے مضطرب نے بتایا ہے کہ یہ بھی صلیبی جنگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ



ہے۔ سامراج نے مسلمانوں کے تشخص کو ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ استعمار دینیوی اغراض اور مذہبی کینوں کا نام ہے۔ جدید سامراج کو اپنی حقیقی اغراض کو میٹھے بولوں کے پس پردہ چھپانے میں جو کمال حاصل ہے دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شیخ غزالی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہماری امت کا مستقبل اس وقت تک روشن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کینہ توزوں کے کینے سے اور غرض مندوں کی اغراض سے نجات نہیں پالیتی۔

## ۱۹۔ نظرات فی القرآن: اس کتاب کے 254 صفحے ہیں۔ اس میں قرآن

مجید کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ جدید و قدیم علماء کے نظریات اس میں سموئے گئے ہیں۔ امر واقعہ سے ہٹے ہوئے علم کی شیخ غزالی کے یہاں کوئی اہمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندہ اور مفید علوم پر بحث کرتے ہیں۔ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جسے کسی صورت میں بھی زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ توانتری ہی اس لیے ہے تاکہ زندگی کے بارے میں افکار کو صحیح یا غلط قرار دے اور زندگی کے بارے میں راہ نمائی کرے۔ کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔

قرآن کیوں نازل ہوا؟ اور اسے کیوں ہمیشہ کے لئے رکھا گیا؟ کیسے جمع ہوا؟ قرآن کریم میں کچھ نمونے اور سورتیں، انسان، زندگی، ثروت، الوہیت، نبوت، قصص، اعجاز قرآنی بہ طور نفسی، علمی و بیانی، قرآن اور اہل کتاب، نسخ کے بارے میں تحقیقی مطالعہ۔

## ۲۰۔ مع اللہ: دراسات فی الدعوة والدعاة: یہ کتاب عام قارئین کے لئے

نہیں بلکہ داعیوں اور مبلغوں کے لیے ہے۔ یہ کتاب شیخ غزالی نے انہی کے لئے لکھی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب الازھر کی انتظامیہ نے شیخ غزالی سے درخواست کی کہ وہ دعوت و ارشاد کے طلبہ کو لیکچر دیں۔ یہ کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک میں کئی مباحث

ہیں۔ اس کے ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔ دعوت کی تعریف، دین کی طرف رسولوں کی دعوت کے عام قوانین۔ حاملین دعوت۔ وسائل دعوت۔ مخالفین کا مقابلہ۔ قرآن و سنت سے دعوت کے کچھ زندہ نمونے، خلفائے راشدین اور علماء امت کے ارشادات دعوت کے بارے میں۔

## ۲۱۔ معركة المصحف في العالم الاسلامي

357 صفحوں پر پھیلی ہوئی یہ کتاب عالم اسلام میں قرآن مجید کے کردار پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں بلکہ اس امت کے حاضر و مستقبل کا احاطہ کرتی ہے۔ جن ممالک میں سامراج اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان میں ہر طرح کا فساد برپا کیا۔ ان ممالک سے سامراج کے ثقافتی و سیاسی اثرات بد کو ختم کرنے کے لئے قرآن شریف اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ قرآن مجید عقیدہ، عبادت، اخلاق اور معاملات میں حق کی مکمل ترجمانی ہے۔ یہ قوموں کی دنیا و آخرت میں کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ اس کتاب کا اصل ہدف، قرآن کریم کی روشنی میں غیر ملکی تسلط کی تمام کوششوں کے خلاف جہاد کرنا ہے اور اسلام کے اصولوں پر سیاسی و سماجی زندگی کی از سر نو تاسیس کرنا ہے۔ کتاب کے اہم عنوانات یہ ہیں۔ قرآن کریم فرد، اجتماع اور مملکت کے لیے، عبادات اور مملکت کی قوت، اسلام نے ہمیشہ عام زندگی پر اثر ڈالا ہے، حق کی نگہبانی ایمان کا معیار ہے، میدان سیاست میں تجدید اسلامی، ثقافتی استعمار، معاشرہ میں عورت کی مرکزیت۔

## ۲۲۔ کفاح دین : صفحات : 312، مولف نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ استعمار

جب مسلم ممالک میں اپنی حامی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچا۔ جن ممالک سے استعمار کو لگانا پڑا ان میں اب تک اس کے اثرات

بانی ہیں۔ اُس نے زمینیں اور علاقے چھوڑ دیئے مگر اپنے ساتھ محکموں کے دل و دماغ پر اب تک اُس کا قبضہ ہے۔ اپنے اس مدعا کی تائید میں شیخ غزالی نے کئی مثالیں دی ہیں۔ مولف نے مصر میں جمال عبدالناصر کی گمراہ کن پالیسیوں پر شدید تنقید کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے مفادات کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ شیخ غزالی نے ثابت کیا ہے کہ جمال عبدالناصر اسلام دشمن عالمی طاقتوں کا آلہ کار تھا۔ کرومر نے مصر کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا جمال نے پہنچایا ہے۔ کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔ اسلام اور مسیحیت کے مابین تعاون، جدید صلیبی رجحان، ترک کردہ ثقافت، ملازمتوں کی دنیا میں۔

## ۲۳۔ الاسلام والطاقات المعطية: 214 صفحوں کی اس کتاب

میں مولف نے دین کے مزاج اور مسلمانوں کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے دونوں میں موازنہ کیا ہے۔ ایک طرف اسلام کے سنہری اصول و مبادی ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کا طرز عمل۔ روئے زمین پر مسلمان ایسے زر خیز اور معدنی دولت سے مالا مال علاقوں میں آباد ہیں کہ پوری دنیا کی خوشحالی ان کے قبضے میں ہے اگر وہ اپنے ذخائر و ملکیت کا درست استعمال کریں تو وہ کسی کے محتاج نہ ہوں بلکہ دنیا کی سب اقوام ان کی دست نگر ہوں۔ مد اعظموں کی اقتصادی زندگی کی رگ و جاں انہی کے ہاتھ میں ہو۔ یہ تو ہے مادی صورت حال، اولیٰ و علمی لحاظ سے بھی مسلمانوں سے بڑھ کر کوئی نہیں اس لیے کہ وہ اسلام و قرآن کے حاملین ہیں۔ اس کے بعد مولف نے بتایا ہے کہ امت اسلامیہ کیوں جمود کا شکار ہے۔ اس کا جمود کیسے ٹوٹ سکتا ہے؟ اس کے روحانی اور فکری ورثہ کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اہم عنوانات یہ ہیں۔ انسانی صلاحیت کی قوت، دینی جذبہ کا کاٹا، انسان کے ساتھ کفر، استبداد صلاحیتوں کو شل کر دیتا ہے، ردی ثقافتوں کا اثر، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام۔ ہماری زندگی کی بنیاد اور ہماری قوت کار از اسلام۔ دین مستقبل۔ موجودہ تہذیب کے بحران۔ اسلامی

اتحاد، اسلامی نظام کے چوکھٹ، اسلامی ممالک کی آزادی۔

## ۲۴۔ حقوق الانسان: بين تعاليم الاسلام و

**اعلان الامم المتحدة:** یہ کتاب 266 صفحات پر محیط ہے۔ اس کا موضوع انسان کے حقوق ہیں۔ حریت، مساوات، انصاف اور عزت۔ اسلام، تمام انسانوں کو بلا تمیز رنگ و نسل اور مال و جاہ یکساں واجب التحريم ٹھہراتا ہے۔ وہ عربی و غیر عربی اور حاکم و محکوم کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا۔ مولف نے اقوام متحدہ کے حقوق انسانی اور اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق کا موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ بڑی طاقتیں، انسانوں کے حقوق ہمیشہ سلب کرتی ہیں جب کہ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں انسانوں کو ان کے مکمل حقوق عطا کئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی بھی رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیمات کا اعادہ ہیں۔ کتاب کے نمایاں موضوعات یہ ہیں۔ عادلانہ مساوات، عدالتی حقوق، آزادیاں، سماج میں مرد و زن، خاندان، ہجرت اور پناہ، اقتصادی عزت، ثقافتی معیار، اسلام میں حقوق انسانی کا عالمی اعلان، اسلام میں انسان کے حقوق۔

## ۲۵۔ خطب الشيخ محمد الغزالي: یہ کتاب شیخ محمد غزالی کی

تقریر کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں ہے جسے قاہرہ سے 1980ء میں دارالاعتصام نے شائع کیا ہے۔ یہ خطبہ شیخ کی علمی گہرائی، بھیرت اور تنوع پسندی کا ثبوت ہیں۔

## ۲۶۔ نظرة على واقعنا الاسلامى فى مطلع

القرن الخامس عشر الهجرى۔ یہ کتاب 1983ء میں قاہرہ

سے چھپی۔ پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر مسلمانانِ عالم اور اسلام کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ مختلف ممالک کے مسلمان جن آزمائشوں سے دوچار ہیں اس کا تذکرہ ہے۔

۲۷۔ **ہذا دیننا** 213 صفحوں کی یہ کتاب، ایجاز، وضاحت اور استیعاب کے ساتھ، اسلامی تعلیمات پر ایک جامع کتاب کا مقام رکھتی ہے۔ مولف نے حقائق اسلام کو جدید دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ دینِ عظیم کی خصوصیات کو تحقیق کے ساتھ دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اہم عنوانات: عقائد، توحید، قضا و قدر، آزادی عقل نہ آزادی شہوت، حریتِ اعتقاد، عبادات کی اقسام اور ان کی صورتیں، خاندان، اخوت، اجتہاد، اجماع، فقہ العبادات، شرائع المعاملات۔

## ۲۸۔ الخدیعة: حقيقة القومية العربية

واسطوره البعث العربی: 283 صفحات کی یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا موضوع ”عرب قومیت“ کا فتنہ ہے۔ مولف نے ”عربی قومیت“ کو سامراج کا پیداکردہ فتنہ و فساد قرار دیا ہے اور اس کے اسلام کے لیے انتہائی نقصان دہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

## ۲۹۔ الجانب العاطفی من الاسلام: اخلاق، سلوک اور

تصوف کے موضوعات پر حاوی یہ کتاب 299 صفحات پر مشتمل ہے۔ عصر حاضر میں جو روحانی خلا پایا جاتا ہے اسے مہ کرنے کے لئے مولف نے اسلامی تعلیمات پیش کی ہیں۔ نفسیاتی، اخلاقی، علمی، فکری اور جذباتی پہلوؤں کی تسکین کے لیے اسلام کے وسیع دامن میں بہت کچھ ہے۔ یہ کتاب تصوف کو خانقاہوں کی محدود دنیا سے نکال کر عمل کے

میدان میں لانے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ تاکہ تھوڑے ایک محرک قوت بن سکے۔ مولف کو یقین ہے کہ اگر اسلامی تعلیمات کو نئی نسلوں کی تربیت میں ایک بنیادی عنصر قرار دیا جائے تو نئی نسلوں کی جذباتی، اخلاقی اور فکری تھکیل نو میں بہت مدد ملے گی۔

### ۳۰۔ عالمیہ الرسالة بین النظرية و التطبيق : یہ

کتاب، اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ نے 1980ء میں شائع کی۔ یہ ایک تحقیقی کتاب ہے جو دعوت کی راہ نمائی اور داعیوں کی تیاری کے لیے عالمی کانفرنسوں کی تحقیقات میں شامل ہے۔ اس کتاب میں شیخ غزالی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کی عالمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے پیروکار، اپنے طرزِ عمل کے عمدہ نمونے انسانیت کے سامنے پیش کریں۔

### ۳۱۔ دفاع عن العقيدة والشریعة ضد مطاعن

**المستشرق :** مشہور یہودی مستشرقین گولڈزیر نے اسلام کے خلاف بغض و کینہ سے بھرپور ایک کتاب ”عقیدہ و شریعت“ لکھی ہے جس میں اسلام پر بے سروپا الزامات تھوپے گئے ہیں۔ شیخ غزالی نے اس کے جواب میں 259 صفحوں کی یہ کتاب تحریر کی۔ مستشرقین کا کوئی کام بھی تعصب اور عیب سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ استعمار کے باقاعدہ ایجنٹ ہوتے ہیں اور ان کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ (اس حقیقت کی تفصیل کے لئے دیکھئے، عالم عرب پر مشنری یلغار، اردو ترجمہ، محمد ظہیر الدین بھٹٹی شائع کردہ : اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور) شیخ غزالی نے اسلام پر کئے گئے تمام اعتراضات کا علمی و تاریخی حقائق سے مدلل جواب دیا ہے۔ کتاب کے بڑے عنوانات ہیں۔ محمد اللہ کے رسول، اللہ کے حضور انبیاء تمام مذاہب کا خلاصہ ہے، مکہ و مدینہ میں اسلام یکساں تھا، سخت پر حملہ،

فقہ اسلامی میں ترقی، رسالت کا عموم اور اس کی دوامیت، شریعت اور ردی قانون کا موازنہ، عقیدہ میں ارتقاء، قرآن میں قشایہ کا مطلب، زہد و تصوف، اسلام روح اور جسم دونوں کی خدمت کرتا ہے۔ مسلمانوں کے اختلاف کی حقیقت، اسلامی اتحاد کے بارے میں، مسلمان استعمار اور صیہونیت کے مابین۔

### ۳۲۔ رکائز الایمان بین العقل والقلب: 288 صفحوں

کی یہ کتاب، مولف کی ایک اور کتاب ”الجبب العاطفی فی الاسلام“ کی تکمیل ہے۔ اس کتاب میں عقل و ضمیر کو وحی و نبوت کی کرنوں سے منور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شبہات کا ازالہ کیا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے مسلمانوں پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

### ۳۳۔ حصاد الغرور: 207 صفحوں کی یہ کتاب یہودیوں اور مسلمانوں

کے مابین کش مکش کا بیان ہے۔ صیہونیت کا جائزہ لینے کے بعد واضح کیا ہے کہ مسلمان یہودیوں کے خلاف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ اپنے دین کا دامن تھامے رہیں۔ مسلمانوں کے سروں پر شکست کا ہتھوڑا اسی لیے برس رہا ہے کہ وہ دین سے برگشتہ ہیں اور دشمنوں کو دوست سمجھنے لگے ہیں۔

### ۳۴۔ الاسلام فی وجہ الزحف الاحمر: اس کے 206

صفحے ہیں۔ یہ کتاب شیخ نے نہایت کٹھن حالات میں لکھی تھی جب کئی عرب ممالک میں کمیونزم اور سوشلزم کا ڈنکا ج رہا تھا۔ وہ سویت یونین کے ساتھ پریم کی پیٹنگیں بوجھا رہے تھے۔ اس کتاب کا مقدمہ پڑھ کر کوئی غیرت مند مسلمان اپنے آنسو نہیں روک سکتا۔ شیخ کے کئی دوستوں نے انہیں اس کتاب کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ آپ اپنی جان کو کیوں عزیز نہیں رکھتے مگر شیخ نے جواب دیا۔ ظالموں کے ظلم سے مسلمانوں کو آگاہ

کرنے کے لئے اگر میری جان بھی قربان ہو جائے تو کوئی پروا نہیں۔ مگر وہ زندگی بہت بُری ہے کہ ہم تو زندہ رہیں اور اسلام فنا ہو جائے۔ کتاب کے عنوانات ہیں: آغازِ تصادم، کمیونزم اور آزادیاں، کمیونزم کے سائے میں اقتصادی حالات، سویت یونین میں مسلمان، اسلام زندگی و موت کے مابین، فلسطین، کمیونزم اور ہماری ذمہ داری۔

### ۳۵۔ قذائف الحق: 242 صفحات کی یہ کتاب، اسلام کے خلاف استعماری

سازشوں کا پردہ چاک کرتی ہے۔ یہودی، عیسائی اور بدھ مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم رکھتے ہیں؟ قطبی کیا چاہتے ہیں؟ عرب قومیت کا کیا مفہوم ہے؟ دعوتِ اسلامی کے بارے میں حکمرانوں کی پالیسی کیا ہے؟ اسلام میں حکومت اور مال کی پالیسی کیا ہے؟ اخوان المسلمون اور صدر ناصر، اسلام کے بغیر عرب صفر ہیں، جہاں آزادی نہیں وہاں دین نہیں، یہ ہیں اس کتاب کے خاص خاص موضوعات۔

### ۳۶۔ الدعوة الاسلامیة مستقبل قرنہا الخامس

عشر: صفحات: 210: یہ کتاب شیخ غزالی نے چودہویں صدی ہجری کے اختتام پر جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض کی فرمائش پر لکھی تھی۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں دعوتِ اسلامی کی صورت حال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آئندہ صدی کے لیے ہمارے کیا فرائض ہیں؟ مختلف اقوام کس طرح اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں؟ مختلف میدانوں میں کام کرنے کا مثالی طریقہ کیا ہے؟ تہذیبِ اسلامی کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ نیز داعیوں کے لیے رکاوٹیں اور ان کا حل وغیرہ اس کتاب کے مباحث ہیں۔



## ۳۷۔ ازمة الشوری فی المجتمعات العربیة

والاسلامیة: شوریٰ پر عمل درآمد میں عالم عرب اور دنیائے اسلام کو کس بحران کا سامنا ہے؟ حالانکہ باہمی مشورائی ہی وہ اہم ستون ہے جس پر اسلامی معاشرہ کی عمارت کھڑی ہونی چاہیے اور یہی اسلام کے قانونی و دستوری نظام کی بنیاد ہے۔

## ۳۸۔ فن الذکر والدعاء عند خاتم الانبیاء: کئی بار

شائع ہونے والی 179 صفحوں کی اس کتاب کا موضوع ذکر و دعا کا سیرت نبوی میں مقام ہے۔ آنحضرت ﷺ کے دعا و ذکر کے سلسلے میں اعمال کو دل کش اسلوب میں بیان کیا ہے۔

## ۳۹۔ دستور الوحدة الثقافية بین المسلمین

239 صفحات کی یہ کتاب کئی اداروں نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کا موضوع استاد امام حسن البنا ہیں۔ شیخ غزالی نے انہیں چودہویں صدی ہجری کا مجدد و قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کئی معرکہ الآراء مسائل کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

## ۴۰۔ واقع العالم الاسلامی فی مطالع القرن

الخامس عشر: 80 صفحوں کی اس کتاب کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشیں ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے عقیدے، دین اور ورثہ سے برگشتہ کرنے کے لئے ہونے والی کوششیں ہیں۔ ان قوتوں اور سازشوں کے سامنے عالم اسلام کی بے بسی ہے۔ اسلامی تنظیمات اور مسلمانوں کے اعمال میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے بھی واضح

کیا ہے۔

## ۴۱۔ مشکلات فی طریق الحیاة الاسلامیة:

صفحات: 143: یہ ہم عصر اسلامی سرگرمیوں کا جائزہ ہے۔ مسلمانوں کے شرعی اور فوجی زوال کے اسباب کا جامع مطالعہ ہے۔ دعوتِ اسلامی کے میدان میں کام کرنے والوں کی مشکلات اور ان کا حل پیش کیا ہے۔

۴۲۔ هموم داعیة: 173 صفحوں کی اس کتاب میں اسلامی معاشرے کے اہم مسائل کا تجزیہ ہے۔

۴۳۔ مائة سوال عن الاسلام: دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں مسلمانوں کو درپیش سوا اہم سوالات کے شیخ غزالی نے بھرپور جوابات دیئے ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

۴۴۔ علل وادویة: 283 صفحات ہیں۔ مسلمانوں کے امراض اور ان سے شفا کے ذرائع پر سیر حاصل عفت ہے۔ عصرِ حاضر کی اہم مسلم شخصیتوں کا جان دار تعارف ہے۔ تعلیم و ثقافت پر گفتگو ہے اور اس کے علاوہ بہت کچھ۔

۴۵۔ مستقبل الاسلام خارج ارضہ۔ کیف

نفکرفیہ۔ صفحات: 202، کتاب میں اہم سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

۴۶۔ قصۃ حیاة: مقہفات من مذکرات الشیخ: یہ دراصل شیخ کی یادداشتوں سے

انتخابات ہیں۔ شیخ کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی اس تحریر کو پہلی بار جنوری 1997ء میں اسلامیہ المعرفۃ کے پرچے میں شائع کیا گیا۔ میں نے وہیں سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

۷۴۔ **سرتاخر العرب والمسلمین**: صفحات: 187 عربوں اور مسلمانوں کی پس ماندگی کا راز، اس کتاب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۷۸۔ **الطریق من هنا**: صفحات: 160، مسلمانوں کے ماضی و حال کی کئی مثالیں دیں ہیں کہ دین اور ہمارے کردار میں کتنا تفاوت پایا جاتا ہے۔ شیخ نے بیداری اور عدم پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل اسی بیداری پر منحصر ہے۔ قرآن کریم کے علمی اعجاز پر صلیبی حملہ کا ذکر ہے۔ جیہ الوداع میں آپ ﷺ کے خطاب کے انسانی پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

۷۹۔ **جہاد الدعوة بین عجز الداخل و کید**

**الخارج**: 192 صفحات کی اس کتاب کا ما حاصل یہ ہے کہ اسلام میں جہاد صرف میدانِ قتال تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے لئے اطلاعات، اقتصادیات، سائنس (خواہ سول ہو یا عسکری)، سیاحت، امداد اور سماجی خدمات کے میدانوں میں کام کرنا جہاد ہے۔

۵۰۔ **الحق المرّ**: پانچ اجزاء پر مشتمل یہ کتاب روشنی کی اس چمک کی مانند ہے جو رات کی تاریکیوں میں راہ رو کے لیے راستہ دکھانے کے کام آتی ہے۔ بیداری و ہوشیاری کا مختصر پیغام۔ ہر شیعہ کا ازالہ، ہر شک کا دفعیہ، ہر غلط فہمی کی تصحیح۔

## ۵۱۔ الغزو والثقافی یمتدفی فراغنا: 424 صفحات۔ مولف

نے مسلمانوں کے اسلامی تصور کو ناقص قرار دیا ہے اور اسے سطحی و طفلانہ کہا ہے۔ مسلمانوں میں پھیلے ہوئے بہت سے تصورات دراصل غیر اسلامی ہیں۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اس کم فہمی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے عیسوی دہر ونی ثقافتی یلغار کا نشانہ بنتے ہیں۔

## ۵۲۔ المحاور الخمسة للقرآن الکریم:

صفحات: 244: اس کتاب کا موضوع قرآن کریم کے پانچ محور ہیں جن کے گرد پورے قرآن کریم کی آیات گھومتی ہیں۔

محور اول: اللہ واحد۔ اس کے ذیلی عنوانات ہیں۔ توحید، قرآن کریم میں قدر و جبر، عقائد و طرز عمل کی پاکیزگی۔

محور دوم: کائنات کی اپنے خالق پر دلالت، ذیلی عنوانات ہیں۔ اسلام میں روحانیت، ذکر و دعا کا ارض و سماء کی تخلیق کے مشاہدے سے ربط، کیا مومن کا کائنات سے الگ تھلگ ہو جانا درست ہے؟

محور سوم: قصص قرآنی۔ ذیلی عنوانات ہیں۔ اسلام کے نفسیاتی و عمرانی پہلو، عربوں کے لئے تعصب، ہماری تاریخ میں علم و حکمت اور حکمرانی کی داستان۔

محور چہارم: علوم انسانی جیسے علم التاريخ، علم سیاست اور علم ثقافت

محور پنجم: میدان تربیت و قانون سازی۔ فرعی عنوانات۔ موجودہ تہذیب کا اخلاقی دیوالیہ پن، احسان، ربا، خیانت۔

## ۵۳۔ السنۃ النبویۃ بین اہل الفقہ و اہل

**الحديث:** 160 صفحات کی یہ معرکہ الآراء کتاب شیخ غزالی نے المعهد العالمی للفقہ الاسلامی کی درخواست پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں اُن لوگوں کی راہ نمائی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ احادیث کی کتابیں پڑھ کر، انہوں نے اسلام کا کھل علمی احاطہ کر لیا ہے۔ اس میں اُن لوگوں کے لئے سبق ہے جو اسلام کے چھلکے کو جانتے اور اُس کی جڑوں کو بھولتے ہیں۔ اس کتاب نے دین کے صحیح فہم کی طرف ہزاروں مسلم خواتین و حضرات کی راہ نمائی کی ہے۔

## ۵۴۔ قضا یا المراقۃ بین التقالید الراكدة

**والوافدة:** 218 صفحات: یہ کتاب عورت کے بارے میں ہے۔ عورت کے مقام و مرتبہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ عورت کے بارے میں غلط تصورات کی بے گئی کی ہے۔

## ۵۵۔ تراثنا الفکری فی میزان الشرع والعقل:

صفحات: 224، دس ابواب پر مشتمل اس کتاب کا مرکزی موضوع اسلام کے علوم نقلی ہیں۔ مسلمانوں کے فکری ورثہ کا شرع و عقل کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ تفسیر، سنت، تاریخ و ادب عربی ہر ایک پر مفصل بحث موجود ہے۔

## ۵۶۔ کیف نتعامل مع القرآن۔ صفحات: 236، قرآن کریم کے

ساتھ مسلمانوں کے طرز عمل پر نہایت عالمانہ مباحث کا مجموعہ ہے۔ قرآن کریم کے علوم پر

تخص کرنے والے طلبہ کے لیے لائق مطالعہ کتاب ہے۔

## ۷۵۔ صیحة تحذیر من دعاة التنصیر :

صفحات: 155: دنیا کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے امریکہ میں مشنریوں نے ایک کانفرنس کی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ملین ڈالر جمع کیے تھے۔ شیخ غزالی نے یہ کتاب اسی کانفرنس کی قراردادوں، تجویز و تقاریر پر مبنی روداد کے خلاف لکھی تھی۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین مختلف فیہ مسائل پر بھی شیخ نے بحث کی ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں عورت کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ یورپ اور امریکہ میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا حضرت عیسیٰؑ خدا ہیں؟ غرضیکہ مختلف موضوعات پر یہ کتاب حاوی ہے۔

## ۷۸۔ نحو تفسیر موضوعی لسور القرآن

الکریم۔

صفحات: 560: یہ قرآن کریم کا نیا مطالعہ ہے۔ مقصد قرآن کریم کی ہر سورۃ کی موضوعی تفسیر ہے۔ یعنی ہر سورۃ کا حیثیت مجموعی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ مطالعہ نہایت مختصر ہے۔ کتاب تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

## ۷۹۔ من کنوز السنۃ: یہ کتاب شیخ کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی۔

## شیخ الغزالی کے بارے میں کتابیں

- (۱)۔ دفع الشبهات عن الشيخ محمد الغزالي: ڈاکٹر احمد حجازی السقا۔
- (۲)۔ الشيخ محمد الغزالي: صور من حياة مجاهد عظيم
- (۳)۔ الشيخ محمد الغزالي: الموقع الفكري والمعارف الفكرية، ڈاکٹر محمد عمارة۔
- (۴)۔ الشيخ الغزالي و معركة المصحف. الف۔ محمد شلبی۔
- (۵)۔ الشيخ الغزالي كما عرفته في نصف قرن، ڈاکٹر يوسف القرضاوی
- (۶)۔ نظرات في فكر الغزالي. ڈاکٹر عامر النجار

www.KitaboSunnat.com

محمد ظہیر الدین بھٹی کی ترجمہ کردہ  
مطبوعہ کتب

- ♦ تحفۃ الواعظین
- ♦ منشیات لورائن کی تباہ کاریاں
- ♦ اسلام دستور حیات
- ♦ سید نابلاہ
- ♦ خزینۃ الاصفیاء - سلسلہ سروردیہ
- ♦ خزینۃ الاصفیاء - سلسلہ نقشبندیہ
- ♦ عالم عرب پر مشنری یلغار
- ♦ اسلامی جامعات: تاریخ، نظام، اثرات
- ♦ شیخ محمد الغزالی، خود نوشت سوانح حیات، نظریات، تالیفات
- ♦ تعلیم و تعلم کے اصول و آداب



## عالم عرب پر مشنری یلغار

مؤلف : ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی ڈاکٹر عمر فروغ

ترجمہ : محمد ظہیر الدین بھٹی

ناشر : اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

یورپ اور امریکہ کے عیسائی مبلغوں اور پادریوں نے عالم اسلام کو بالعموم اور دنیائے عرب کو بالخصوص عیسائی بنانے کے لیے کس طرح کی کوششیں کیں۔ عیسائی مبلغ کس طرح سامراج کا آلہ کار بنے اور انھوں نے استعمار کے ہر لول دستے کا کردار کیسے ادا کیا؟ تیرہ ابواب اور 406 صفحات پر مشتمل اس چوکھڑے والی تحقیقی کتاب میں مسیحی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں، ان کی دسیسہ کاریوں، ان کے حقیقی اغراض و مقاصد اور ان کے مکرو فریب کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ تعلیم، علاج معالجہ، صحافت، مصوری، اسکاؤٹنگ اور مالی و دفنی امداد و اعانت کے ذریعے مسیحی مشنریوں نے عیسائی سازی کا مکروہ کام کیا۔ ان تمام باتوں کی حقیقت جاننے کے لیے امریکن یونیورسٹی برودت کے دو فارغ التحصیل مسلمان محقق اسکالرز کے تحقیقی کام "التبشیر والاستعمار فی بلاد العربیۃ" کے اردو ترجمہ "عالم عرب پر مشنری یلغار" کا مطالعہ کیجئے۔ اس کتاب کا روسی زبان سمیت دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی مدد سے فرانسیسی، برطانیہ میں فروخت پر پابندی عائد ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی بات بھی حوالے بغیر درج نہیں کی گئی۔ اس میں مشنریوں اور پادریوں کی ایک سو سے زائد فرائیزی اور انگریزی کتابوں کے مکمل حوالے دیئے گئے ہیں۔ مترجم نے اپنے جامع مقدمہ میں پاکستان میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں اور عیسائی بنانے کے لیے ان کے گھناؤنے ہتھکنڈوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

## اسلام - دستور حیات

مولف : ممتاز عالم دین اور محقق السید سابق رحمۃ اللہ علیہ  
ترجمہ : محمد ظہیر الدین بھٹی  
ناشر : اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ  
۱۳۔ ای شاہ عالم پارک لاہور

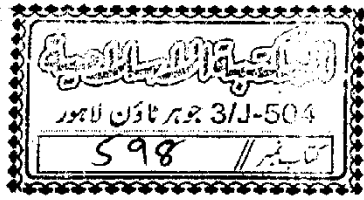
بلاشبہ دین اسلام ایک مکمل دستور حیات ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کے بارے میں ہدایات و راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ زندگی کے تین پہلو ہیں: روحانی، اخلاقی اور معاشرتی۔ دنیائے عرب کے مشہور عالم دین اور کئی کتابوں کے مصنف السید سابق رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے انہی تین پہلوؤں کا عالمانہ مگر عام فہم زبان میں جائزہ لیا ہے۔ ان کی مشہور عالم کتاب "اسلامنا" کا سلیس اور شگفتہ اردو ترجمہ "اسلام - دستور حیات" کے نام سے چھپا ہے۔ 360 صفحات پر مشتمل یہ کتاب دین اسلام کی اہم جہت روحانی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات کا بہترین تعارف، خلاصہ اور نمونہ ہے۔ روحانی پہلو کے تحت 'اسلام میں غور و فکر کی اہمیت'، ایمان، غلو، صنیعت، توکل، محبت الہی، اللہ کی اپنے بندوں سے محبت، شکر، تقویٰ، خشیت الہی، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، عبادت کی اہمیت اور عبادات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی حکمتیں، اسرار اور اخلاقی اثرات کے موضوعات کا تفصیلی بیان ہے۔ اخلاقی پہلو کے زیر عنوان خیر، استقامت، احسان، حیاء، امانت، صداقت، نرمی اور تواضع و انکساری پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ معاشرتی پہلو کے ضمن میں درج ذیل عنوانات پر قرآن و سنت اور بزرگان دین کے اقوال کی روشنی میں سیر حاصل بحث موجود ہے۔ اسلامی معاشرے میں مرد و زن کا دائرہ کار اور فرق مراتب، عورتیں مردوں کی شریک کار، لطافت قلب و نظر، اولاد کی تربیت، والدین سے حسن سلوک، کمزوروں اور ناتوانوں سے کیسے پیش آنا چاہیے اور احترام انسانیت سبھی امور پر اسلامی ہدایت و راہنمائی کو نہایت خوبصورت اسلوب میں واضح کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب عامۃ المسلمین کے لیے عام طور پر اور علماء و خطباء و اہل علمین، اساتذہ و کلاء، طلبہ و طالبات، دینی تحریکوں اور اسلامی تنظیموں سے وابستہ ہر کتب فکر کے خواہن و حضرات کے لیے خاص طور پر نہایت مفید ہے۔ یہ کتاب فرقہ واریت اور تعصب سے نجات دلا کر درخشاں اسلامی نظام فکر سے مربوط کرنے میں بے حد اثر انگیز ثابت ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے قارئین کی دینی معلومات میں پیش بیاض اضافہ ہوگا۔ مقررین کے شائقین اور تبلیغ دین کے حتمی خواہن و حضرات کے لیے یہ کتاب ایک بہترین سرمایہ ہے۔ غرضیکہ یہ انتہائی اہم کتاب ہے اور ہر دین دار مسلم گھرانے کے ہر فرد کے لیے ناگزیر ہے۔

## اسلامی جامعات (تاریخ، نظام، اثرات)

تالیف : پروفیسر عبدالرحیم غنیہ  
ترجمہ : محمد ظہیر الدین بھٹی  
قیمت : ۱۹۵ روپے  
ناشر : اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ  
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

اسلام میں تعلیم و تدریس اور علم و دانش کی اہمیت اور مسلمانوں کا اس سے بے پناہ شغف کسی تعارف کا محتاج نہیں مگر اسلام کے نظام تعلیم اور اسلام کے تعلیمی اداروں کی مکمل تاریخ ابھی تک یکجا نہیں ہو سکی۔ مغرب کے پروفیسر عبدالرحیم غنیہ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ ان کی کتاب "تاریخ الجامعات الاسلامیة الکبریٰ" کا ترجمہ "اسلامی جامعات" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۴۹۶ صفحات کی اس کتاب میں اسلامی تعلیمی اداروں کی مکمل تاریخ، نظام اور اس کے اثرات سمٹ کر آچکے ہیں۔ اس کتاب میں 'اسلامی یونیورسٹیوں کی پیدائش اور ترقی'، 'عمومی یونیورسٹیوں'، 'اکادمیوں طیبہ کالجوں'، 'ہسپتالوں اور تقریباً اسی تعلیمی اداروں کا مفصل تعارف دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے فلسفہ تعلیم، استاد کا مقام و مرتبہ، 'درسی مواد'، 'غیر زبانوں کی تدریس'، 'تدریس کے طریقے'، 'طلبہ کی تحصیل طبقوں میں تقسیم'، 'حصول علم کے ذرائع'، 'سندات اور اجازتوں کی اقسام'، 'اہم ترین علمی القاب کا بیان ہے۔ تعلیمی اداروں کو ملنے والی امداد کی صورتیں، مالی آمدنیاں، 'انتظامیہ'، 'دور ان تعلیم کسب و زکار'، 'تحصیل علم کے لوازمات'، 'گھریلو تعلیمی ادارے'، 'اساتذہ کی تنخواہیں'، 'یوشن فیس کا جواز و عدم جواز'، 'کتب خانے اور ان کا انتظام و انصرام'، 'افتتاح کے موقع پر ہونے والے جشن اور رسمیں'، 'علمی لباس'، 'چھٹیوں کے دن'، 'طلبہ کی سماجی سرگرمیاں'، 'مختص کا مزاجیہ کردار'، 'مراکش میں سلطان الطلبة کا دلچسپ جشن'۔ یونیورسٹیوں کی عمارت، 'اسلام میں دانش گاہی آموزش اور عورت'، 'فردغ تعلیم میں خواتین کا حصہ'، 'تاریخ اسلام کی مشہور ترین مدارس و معلمات کا تعارف'، 'ایرانی علاقوں میں مدارس کا نظام'، 'شیعہ مدارس و جامعات کی مکمل تفصیلات'۔ غرضیکہ اس کتاب میں تعلیم و تعلم اور درس و تدریس اور اس سے متعلق سب امور کا مفصل تذکرہ ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے ہر صاحب ذوق کے مطالعہ کے لیے اس ناگزیر کتاب میں کوئی بات بھی بلا حوالہ درج نہیں ہے۔



اس کتاب میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور آہیں  
 بھی، اس میں حق کی للکار بھی ہے اور باطل کی کج  
 رفتاری کا تذکرہ بھی، مصر کے شاہ فاروق کے  
 شیخ غزالی کی اقتداء میں نماز جمعہ پڑھنے کا دلچسپ  
 واقعہ بھی اور کرنل انور سادات کے پیچھے غزالی جیسے  
 عالم دین کا نماز جمعہ پڑھنے کا عبرت انگیز سانحہ بھی،  
 محمد الغزالی کا اشتراکی اتحاد میں شامل ہونے کا تلخ  
 تجربہ بھی اور اخوان المسلمون کے ساتھ قید خانے  
 میں مجبوس رہنا بھی، غرض یہ کہ داستان حیات  
 ایمان افروز بھی ہے اور جرأت انگیز بھی، لائق  
 مطالعہ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔